کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ماہوار رسالہ

مرتبہ

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس

نمبر اوّل بابتہ ماہ رجب ۱۳۳۶ھ مطابق اپریل ۱۹۱۸ء جلد اوّل

باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج میں طبع ہو کر

(صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ سے شایع ہوا)

قیمت سالانہ مع محصول ۳ روپے — قیمت فی پرچہ ۶ر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ماہواری رسالہ

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پروگرام میں ایک عرصہ سے یہ تجویز داخل تھی کہ کانفرنس کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جاوے اور اس کے ذریعے سے قوم اور ملک میں تعلیمی مضامین اور معلومات کی اشاعت کی جائے لیکن ہر ایک کام کو کامیابی اور درستی سے کرنے کے لیے ضروری وسائل اور سامان درکار ہوتے ہیں، اور خاص کر ایسے کام کے لیے جیسا کہ اس رسالہ کا اجراء۔ مگر خالق اکبر جزائے خیر دے سرکار عالیہ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال بالقابہا کو جن کی روشن ضمیر

سرپرستی کی بدولت ضروری سامان کی فراہمی کا آغاز ہوگیا اور تیس سالہ زندگی کے بعد کانفرنس کو نہ صرف ایک عالی شان اور وسیع مکان دستیاب ہوگیا بلکہ تعلیمی معلومات کے ذرایع بھی حاصل ہوگئے اور خدا کے بزرگ و برتر اجر عظیم دے ہز اگزالٹیڈ ہائنیس حضور پُر نور اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ کو جن کی شاہانہ فیاضی اور دستگیری کی بدولت سرمایۂ کانفرنس کو استقلال نصیب ہوا۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہی کہ مذکورۂ بالا دیرینہ مقصد آج اس رسالہ کی شکل میں ظہور پذیر ہو کر قوم اور ملک کے سامنے پیش ہو رہا ہی۔ مسئلہ تعلیم کی اہمیت اور اس کی نسبت قوم اور ملک میں جو واقفیت اور دلچسپی ہی اُس کے لحاظ سے اس قسم کے رسالہ کی ضرورت ظاہر ہی۔ اور جہاں تک ہم کو علم ہی اس ملک میں اُردو یا انگریزی زبانوں میں اس قسم کا کوئی رسالہ شایع نہیں ہوتا۔ اس لیے اب وقت ہی کہ ہمارے ملک اور قوم کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن اس کام کا آغاز کرے۔ اس رسالہ کی اشاعت سے جو مقصد ہی اُس کی تفصیل حسب ذیل ہی۔

(۱) گو عرصہ سے ملک میں اور اُس کے بعد ہماری قوم میں تعلیمی تحریک جاری ہے لیکن یہ واقعہ ہی کہ تعلیم کا وہ حقیقی مفہوم جو صدیوں کے غور اور تجربوں کے بعد متمدن قوموں نے بیدار دُنیا کے سامنے پیش کیا ہی۔ اور جس نے اُصول اور طریقۂ تعلیم میں نئی روح پھونک دی ہی، اُس کا علم ہمارے ملک اور قوم میں عام طور پر بہت ہی کم ہی اور اس لیے ضرورت ہی کہ اُس سے اس ملک کی پبلک آشنا کی جائے۔

(۲) جو نظامِ تعلیم گورنمنٹ کی طرف سے ملک میں قایم ہی اُس کے حُسن و قبح کے

متعلق صحیح رائے قایم کرنے کی قابلیت ہم میں بہت ہی کم ہی اُس کی نسبت اطمینان یا غیر اطمینان کا اظہار اکثر بغیر سوچے سمجھے کیا جاتا ہی ضرورت اس کی ہی کہ موجودہ نظام تعلیم کے جس قدر شعبے ہیں اُن کی جانچ، قومی اور ملکی خاص حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمہ تعلیمی اُصول کے مطابق کی جائے۔ اور اس غرض کے لیے پبلک کے سامنے وہ تعلیمی معلومات پیش کی جائیں جن سے ان مسائل کے سمجھنے میں آسانی ہو اور مدد ملے۔

(۳) چونکہ تعلیمی ضروریات کا احساس ایک حد تک قوم میں پیدا ہو گیا ہی اور سرکاری درسگاہوں میں کافی گنجایش اور موقع داخلہ کا نہیں ہی اس لیے قومی تعلیم گاہوں کے قیام کا خیال اور حوصلہ پیدا ہو رہا ہی اور جا بجا چھوٹے اور بڑے اسکول قایم ہوئے ہیں مگر محض تعلیمی ضرورت کا احساس یا قومی جوش تعلیم گاہوں کو کامیابی سے قایم کرنے اور چلانے کے لیئے کافی نہیں ہی، اس لیے گو اسلامیہ مدارس جگہ جگہ قایم ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں، لیکن تعلیمی اُصول سے ناواقفیت بہت کچھ اس قسم کے مدارس کی کامیابی میں سدِّ راہ ہی۔ ہمیں ضرورت ہی کہ قوم میں وہ تعلیمی معلومات پھیلائی جائیں جو تعلیم گاہوں کی کامیابی کے لیے لازمی ہیں۔

(۴) سرکاری مدارس ہوں یا قومی اُن سے پورا استفادہ اس پر منحصر ہی کہ اُن کے متعلق قوم اور پبلک کا نقطۂ خیال صحیح اُصول پر مبنی ہو، ملک کی تعلیم گاہوں کے متعلق جو اُن کی ذمہ داری ہی اُس کا پورا پورا احساس ہو۔ مثلاً کسی کالج یا اسکول میں اگر منتظم جماعت اور اس کے استادوں میں کچھ اختلاف ہو یا طلباء میں شورش یا کسی

تعلیم گاہ کے متعلق ایسے مسائل غور اور تصفیہ کے لیے درپیش ہوں جن کے سمجھنے اور سلجھانے کے لیے ماہرانہ علم اور تجربہ کی ضرورت ہو تو اُن امور کی نسبت قومی پبلک کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق پبلک کے صحیح یا غلط رجحان کا قومی تعلیم گاہوں کے نظم و نسق اور نتیجہ پر بہت کچھ اثر پڑتا ہی اور اس لیے ازبس ضروری ہی کہ ان معاملات کے متعلق پبلک کے سامنے صحیح اُصول اور طریقے پیش ہوتے رہیں تاکہ بے محل اظہارِ جوش اور ہمدردی اور دخل در معقولات سے قوم خود اپنی بہترین مقاصد کو صدمہ پہنچانے سے باز رہے۔

(۵) گو اس ملک میں سرکاری اور قومی درسگاہیں ایک عرصہ سے موجود ہیں اور روز بروز بڑھتی جاتی ہیں لیکن ایک حد تک اس مُلک کا کُل نظامِ تعلیم آزمایش کے دَور سے ابھی تک نہیں نکلا، اور خاص کر ہماری قومی تعلیم گاہیں ابھی تک بہت کچھ ابتدائی منزل میں ہیں۔ اس لیے ضرورت ہی کہ مختلف اقسام اور مختلف صوبوں اور قوموں کی تعلیم گاہوں کے حالات ایک جگہ جمع ہو کر اُن سے مُفید نتایج اخذ کیئے جائیں اور مختلف صوبوں اور قوموں کے تجربوں سے قومی تعلیم گاہوں کے منتظمین مطلع کیے جائیں۔

(۶) سرکاری تعلیم گاہوں سے پورا فائدہ نہ اُٹھانے کی مُسلمانوں کے لیے ایک بڑی وجہ یہ ہی کہ وہ ان مسائل اور قواعد اور طریقوں سے واقف نہیں جن کے ذریعہ سے وہ منظور شدہ مراعات سے مستفید ہوسکتے ہیں اس لیے ضرورت کہ ہر ایک صوبہ کے

حالات کے لحاظ سے مسلمان پبلک کو اُن مراعات اور مواقع سے آگاہ کیا جاوے جن کے وسیلے سے وہ سرکاری مدارس سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

(۷) امپیریل گورنمنٹ اور صوبوں کی گورنمنٹوں کے سامنے اکثر تعلیمی مسائل پیش ہوتے رہتے ہیں اور اُن کے متعلق قانون، رزولیوشنوں و سرکلروں کی شکل میں گورنمنٹ کے احکام نافذ ہوتے رہتے ہیں ان کے متعلق قومی اور ملی نقطۂ خیال سے گورنمنٹ کو مشورہ دینا، ایک نہایت اہم اور ضروری تعلیمی خدمت ہے۔

(۸) مختلف صوبوں کی تعلیمی حالت اور یونیورسٹی اور دوسرے شعبہ ہائے تعلیم کے امتحانات کے نتائج پر وقتاً فوقتاً تنقید کرنا ضروری ہے۔

(۹) آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر اور پراونشیل کانفرنسوں اور لوکل کمیٹیوں کے ذریعہ سے جو قومی تعلیمی خدمات انجام پاویں اُن سے پبلک کو آگاہ کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔

(۱۰) علاوہ مذکورۂ بالا مقاصد کے (جو اصلی ہیں) اس رسالہ سے یہ بھی غرض ہے کہ عام فہم طریقہ پر پبلک کو سائنس کے عام اُصول سے آشنا کرے۔

مندرجہ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ رسالہ حسب ذیل حصوں میں منقسم ہوگا۔

حصہ اوّل میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کی شاخوں کی کارروائیاں ہر صوبوں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت، سفیران کانفرنس کی مختلف مقامات کے متعلق رپورٹیں اسلامی اسکولوں اور بورڈنگ ہاؤسوں کے حالات اور وصول شدہ چندہ

کی فہرستیں درج ہونگی۔

حصّہ دوم میں بچّوں کی تربیت اور ابتدائی تعلیم کے متعلق مشورے ہر صوبہ کی ابتدائی، وسطی اعلیٰ اور ٹکنیکل تعلیم کے متعلق معلومات، انگلستان، جرمن، امریکہ، اور جاپان کے موجودہ طرزِ عمل کی کیفیت درج ہوگی اور اُس کا یہاں کے جدید اور قدیم طرزِ تعلیم سے مقابلہ کیا جائیگا اور مختلف مسائل تعلیمی پر بحث کی جائیگی۔

حصّہ سوم میں معلومات عامہ بڑھانے کی غرض سے عام فہم طریقے پر سائنس کے اُصول بیان کیے جائیں گے اور بتایا جائیگا کہ سائنس کے کرشمے جو ہم ایجادات کی شکل میں روزمرّہ دیکھتے ہیں وہ کن اُصول پر مبنی ہیں ریل گاڑی، موٹر کار، ایروپلین وغیرہ کس طرح پر چلتے ہیں تار برقی اور بے تار کی خبر رسانی کن اُصول پر مبنی ہی۔ بجلی اور گیس کی روشنی کس طرح پر ہوتی ہی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح پر جو سائنس کے نتائج روزمرّہ اور ہر وقت ہماری نگاہ سے گزرتے رہتے ہیں اُن کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کا موقع ہم کو ملے گا۔

حصّہ اوّل و دوم کا اڈیٹر خاکسار آنریری جائنٹ سکرٹری ہوگا۔ حصّہ سوم کی آنریری اڈیٹری فیروزالدین مُراد صاحب ایم ایس سی (محمڈن کالج کے پروفیسر طبیعات) نے مہربانی سے قبول کی ہی۔ یہ بھی تجویز ہی کہ عمدہ مضامین پر مضمون نگاروں کو معقول معاوضہ دیا جاوے جس کا فیصلہ ایک مختصر کمیٹی کے سُپرد ہوگا۔

یہ ماہواری رسالہ تقریباً تین جزو کا ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ

پرہر مہینے کی آخر تاریخ کو دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑہ سے شایع ہوگا۔
چونکہ رسالہ کا مقصد مالی منفعت نہیں اس لیے خواہش یہ تھی کہ اس کی سالانہ قیمت بہت کم ہو، تاکہ ہر طبقہ کے مطالعہ میں پہنچ سکے مگر آج کل کاغذ اور چھپائی کی گرانی اور عمدہ مضمون نگاروں کو معقول معاوضہ دینے کا خیال ہم کو مجبور کرتا ہی کہ اس کی قیمت فی الحال تین روپیہ سالانہ مقرر کریں جو بنام رجسٹرار صاحب محمدن کالج علی گڑہ ارسال ہونی چاہیئے اور ان کو یہ ضرور بتلایا جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی ہی باقی خط و کتابت رسالے کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑہ ہونی چاہیئے۔

اُمید ہی کہ پبلک خریداری سے اس رسالہ کی مدد کریگی اور ملک کے لایق مضمون نگار اپنے قابل قدر مضامین سے اس کی قدر افزائی کرینگے۔

آخر میں یہ عرض ضروری ہی کہ ہم مقاصد بالا میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک ملک کے اہل نظر ماہرین تعلیم مضامین سے ہماری مدد نہ فرمائیں۔ فی الواقع ہم نے اُنہی کی مدد پر اعتماد کرکے اشاعت رسالہ کی جرأت کی ہی ٥

ما بداں منزلِ عالی نتوانیم رسید
ہاں مگر لطفِ شما پیش نہد گامی چند

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

اسلامی تعلیمی کانفرنس کے لٹریچر کی مفت تقسیم

دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مندرجۂ ذیل کتب رپورٹ و رسائل جو مختلف تعلیمی و اصلاحی مضامین پر مشتمل ہیں مفت تقسیم کے لیے موجود ہیں جو صرف ڈاک کے ٹکٹ وصول ہونے پر بھیجے جائینگے۔ ہر کتاب کے مقابلہ میں محصول ڈاک درج کیا جاتا ہے۔

تفصیل کتب	محصول	تفصیل کتب	محصول
۱- رپورٹ کانفرنس اجلاس سیزدہم سنہ ۱۸۹۹ء بست و دوم سنہ ۱۹۰۸ء بست و چہارم سنہ ۱۹۱۰ء بست و پنجم سنہ ۱۹۱۱ء بست و ششم سنہ ۱۹۱۳ء بست و ہشتم سنہ ۱۹۱۴ء - سی ام سنہ ۱۹۱۶ء	فی رپورٹ ۴ر	۷- مسئلہ تعلیم مسلمانانِ کشمیر	۰ر
		۸- خط نواب محسن الملک بہادر دربارہ کانفرنس	۰ر
		۹- مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ	۱ر
		۱۰- ترجمہ خطبۂ صدارت کانفرنس سنہ ۱۹۱۶ء	۰ر
۲- رسالہ التربیت والتعلیم - - - -	۱ر	۱۱- مختصر رپورٹ اجلاس کانفرنس سنہ ۱۹۱۶ء	۰ر
۳- رسالہ مکینکل تعلیم اور مسلمان - - -	۰ر	۱۲- خلاصہ کارروائی کانفرنس سنہ ۱۸۸۶ء لغایتہ سنہ ۱۸۱۶ء	۱ر
۴- رسالہ تمدن و معاشرت - - - - -	۱ر	۱۳- مجموعہ رزولیوشنہای دہ سالہ سنہ ۱۸۸۶ء لغایتہ سنہ ۱۸۹۵ء	۰ر
۵- پریسیڈنشل اڈریس عالی جناب میجر سید حسین صاحب بلگرامی اردو	۱ر	۱۴- خلاصہ کارروائی اجلاس ہفدہم	۱ر
۶- مختصر بیان متعلق گورنمنٹ رزولیوشن ۲۵ر اگست سنہ ۱۹۱۲ء		۱۵- لکچر نواب محسن الملک بہادر مرحوم	۰ر
دربارہ ابتدائی تعلیم مسلمانان	۰ر	۱۶- کانفرنس کا ماضی و مستقبل	۰ر

خاکسار

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس - سلطان جہاں منزل - علی گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

حصہ اوّل

اسلامی درسگاہوں کا معائنہ

انجمن تعلیم المسلمین اودھ کے جلسہ کی شرکت کے لئے ۸ مارچ ۱۹۱۸ء کو میں علیگڈھ سے روانہ ہوا اثنائے سفر میں چند گھنٹے کے لئے کانپور میں قیام کرنا پڑا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھکر میں نے کانپور کی اسلامی درسگاہوں کا معائنہ کیا۔ قاضی فضل الرحمن صاحب بی اے، ایل ایل بی وکیل کانپور اور سکرٹری صاحب مدرسہ الہیات نے

مہربانی سے ان درسگاہوں کے حالات معلوم کرنے اور معائنہ میں مدد دی۔ کانپور کے مشہور مخیر خاں بہادر حافظ محمد حلیم صاحب بھی اسلامیہ ہائی اسکول کے معائنہ کے وقت تشریف رکھتے تھے۔ مدرسہ الٰہیات، اسلامیہ ہائی اسکول اور اسلامی یتیم خانہ کا یکے بعد دیگرے معائنہ کیا گیا۔ جو کچھ بچشم خود میں نے دیکھا اور جو حالات مختلف رجسٹروں اور ان درسگاہوں کے منتظمین کی زبانی معلوم ہوئے ان کے لحاظ سے میں یہ عرض کرسکتا ہوں کہ کانپور کے مسلمان تاجران چرم کی قومی ہمدردی اور کاروباری زندگی کی یہ برکت ہے۔ ان اصحاب کی ایک انجمن بنام انجمن اسلامیہ عرصہ سے قایم ہے جس کے ماتحت مدرسہ الٰہیات اور مسلم ہائی اسکول کی درسگاہیں ہیں۔ انجمن کے پاس اس وقت مبلغ بیس ہزار روپیہ نقد ہے اور تقریباً چار سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے۔ آمدنی کا ذریعہ اتفاق و اتحاد باہمی کی ایک سبق آموز مثال ہے یعنی چمڑے کی تجارت میں یہ قانون برادری کا نافذ ہے کہ بائع و مشتری کو ہر کھال پر ایک آنہ انجمن کو دینا ہوتا ہے۔ خدائتعالیٰ ان باحمیت برادران ملت کی تجارت کو فروغ دے جن کی اسلامی ہمدردی کی بدولت قومی فلاح و بہبود کے کام خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

مدرسہ الٰہیات | اس مدرسہ کا مقصد اوّلین حفاظت و اشاعت اسلام ہے یعنی ایسے واعظ و مبلغ تیار کرنا جو نہ صرف حکیمانہ مناظرہ کرسکیں بلکہ غیر اقوام کو دعوۃ اسلام دے سکیں۔ نصاب تعلیم میں علاوہ علوم اسلامیہ اور دینیات کے دیگر مذاہب کے اصول

وعقاید سے کافی واقفیت پیدا کرنے کا اہتمام ہے اور سنسکرت زبان کی تعلیم بھی لازمی ہے البتہ انگریزی زبان بطور اختیاری مضمون کے ہے۔ اس وقت طلبہ کی تعداد ۲۰۰ ہے عربی کے سلسلہ میں ۱۵ طالب علم ہیں مدرسہ کے ایک ہونہار طالب علم سنسکرت زبان میں شاستری کا امتحان ان کے علاوہ دے رہے ہیں۔ مدرسہ کے پرنسپل مولانا عبدالقادر صاحب آزاد سُبحانی ہیں ان کے علاوہ تین عالم اور ہیں نائب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عالم مولوی احمد اللہ صاحب ہیں۔ سنسکرت کی تعلیم کے لئے ایک پنڈت اور انگریزی کی تعلیم کے لئے ماسٹر ملازم ہیں۔ مدرسہ کا مکان کرایہ کا ہے ۴۰ روپیہ ماہوار کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ طلبہ کو دس روپیہ اور معہ ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے کل خرچ مدرسہ کا تین سو روپیہ ماہوار سے زاید ہے جو انجمن اسلامیہ ادا کرتی ہے۔

مسلم ہائی اسکول کانپور یہ اسکول بھی مدرسہ الٰہیات کی طرح انجمن اسلامیہ کانپور کی زیر سرپرستی جاری ہے۔ تقریباً (۲۲۵) طلبہ مختلف جماعتوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ہیڈ ماسٹر مولوی عابد حسین صاحب فریدی ایم اے ایل ٹی ہیں جو محمدن کالج علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں۔ اسٹاف پورا ہے مدرسہ کا فرنیچر خصوصیت کے ساتھ عمدہ اور زمانہ حال کے نمونہ کے مطابق ہے۔ مکان کرایہ کا ہے ۹۰ روپیہ ماہوار کرایہ ہے۔ بیرونجات کے غیر مستطیع طلبہ کے قیام کا بھی انتظام ہے مبلغ دو سو روپیہ ماہوار گورنمنٹ سے گرانٹ ان ایڈ ملتا ہے باقی فیس کے ذریعہ سے آمدنی ہوتی ہے

بقیہ تمام اخراجات انجمن اسلامیہ ادا کرتی ہے منتظمین مدرسہ اس فکر میں ہیں کہ مدرسہ کی عمارت تعمیر کرائیں خدا تعالی ان کے ارادہ کو جلد پورا فرما دے۔ موجودہ عمارت بلحاظ گنجایش تکلیف دہ ہے۔

اسلامی یتیم خانہ کانپور | یہ یتیم خانہ عرصہ دراز سے قایم ہے مکان شاندار اور یتیم خانہ کا مملوکہ ہے اس وقت ۳۴ یتیم بچے داخل ہیں ان میں سے لڑکیاں بھی ہیں سب سے چھوٹا بچہ جو کل ہی داخل ہوا تھا ۲½ سال کی عمر کا ہے۔ ان بچوں کو علاوہ نوشت و خواند کے کوئی ہنر بھی سکھایا جاتا ہے فیتہ بافی کا کام کرتے ہوئے میں نے دیکھا یتیم خانہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرکے میونسپل اسکول میں بچے داخل کرائے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کو سینا پرونا اور کھانا پکانا بھی سکھایا جاتا ہے۔ اور بلوغت پر ان کا عقد کر دیا جاتا ہے ماہوار خرچ تقریباً ۴۰۰ روپیہ ہے ۵۰ ماہوار میونسپلٹی دیتی ہے اور گورنمنٹ کے ذریعہ سے جو یتیم بچہ داخل ہوتا ہے اُس کے لئے وظیفہ سرکار سے ملتا ہے چنانچہ اس وقت مبلغ بیس روپیہ گورنمنٹ کی جانب سے یتیم خانہ کو ملتے ہیں تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ نقد یتیم خانہ کے لئے موجود ہے اور حال ہی میں ۵۰ ہزار کی قیمتی جایداد منشی ابوالحسن صاحب مرحوم تاجر کانپور کے ورثا نے بھی یتیم خانہ کے لئے وقف کی ہے۔ علاوہ ان کے چندہ کے ذریعہ سے آمدنی ہوتی ہے۔ جہاں تک میں نے یتیم خانہ کے حالات اور یتیم بچوں کے طریق رہایش کو سرسری نظر سے دیکھا منتظمین کی توجہ ایک امر کی جانب خصوصیت کے ساتھ مبذول کرانا چاہتا ہوں

اور وہ یہ ہی کہ یتیم بچوں کی پرورش ایسے طریقہ سے کی جائے اور ان کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ ہو کہ وہ اپنی یتیمی و کس مپرسی کی حالت کو محسوس نہ کرنے پائیں اور ان میں غیرت و حمیت کا مادہ بالکل ضائع نہ ہو جائے تاکہ سن شعور کو پہونچکر وہ قوم و ملت کے کارآمد افراد بن سکیں مگر جس طرح یتیم بچے یتیم خانہ کانپور میں رہتے ہیں وہ سراپا یتیمی کی تصویر ہی لڑکوں سے تقریروں میں اُن کی بیکسی کا افسانہ کھلوانا دل کو بے حس کرتا ہی۔

مدرسہ مسلمات لکھنؤ ۱۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو بہمراہی جناب خان بہادر سید حسین صاحب سکرٹری مسلم گرلس اسکول میں نے اس مدرسہ کا معائنہ کیا۔ طالبات اور پردہ نشین اُستانیاں دوسری کوٹھی میں بھیجدی گیئں تھیں مس رام بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی ہیڈ مسٹریس نے براہ مہربانی مدرسہ کا معائنہ کرایا۔ شہر سے باہر ایک پُرفضا مقام پر دو بنگلے کرایہ پر لئے گئے ہیں جن کا ماہوار کرایہ ۲۵۰ روپیہ ہی۔ احاطہ کے لئے پردہ کی دیوار ہی ایک بنگلے میں اسکول ہی اور دوسرا لڑکیوں کے قیام کے لئے ہی اسکول کا مکان ناکافی ہی اور دو دو تین تین جماعتیں ایک ہی کمرے میں قریب قریب بیٹھتی ہیں۔ نصاب تعلیم سرکاری مدارس کے مطابق ہی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ علی گڑھ کی کمیٹی نصاب متعلقہ تعلیم نسواں کے مُرتب کردہ رسائل دینیات علاوہ قرآن شریف کے پڑھائے جاتے ہیں۔ سُنی و شیعہ دونوں فرقوں کی لڑکیوں کی مذہبی

تعلیم کا جداگانہ انتظام ہے۔ نماز کی پابندی کا اہتمام بھی معلوم ہوتا ہے اس وقت
۷۴ لڑکیاں پڑھتی ہیں جس میں زیادہ تر بورڈر ہیں اور بعض لڑکیاں مدراس و ہوشنگ آباد
وغیرہ دور دراز مقامات سے آکر اسکول میں داخل ہوئی ہیں اُستانیوں کی ماہوار
تنخواہوں کا خرچ تقریباً چار سو روپیہ ہے خاص خاص ذرائع آمدنی یہ ہیں۔
فیس کی آمدنی تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ اور ۶۰ روپیہ ماہوار عطیہ آنریبل سر راجہ صاحب
محمود آباد۔ دو سو روپیہ ماہوار عطیہ ریاست بھوپال و ۱۳۶ ماہوار منافع جائداد وقف کردہ
سید کرامت حسین صاحب مرحوم۔ سال گزشتہ کی آمدنی و خرچ کے گوشوارہ دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ آمدنی و خرچ کی رقوم مساوی ہیں۔ یہ اسکول خاص شہر لکھنؤ کی
آبادی سے زیادہ فاصلہ پر ہے اس لئے شہر کی لڑکیاں اب تک معدودے چند
تھیں لیکن اب شہر سے لڑکیوں کو اسکول پہونچانے کے لئے پردہ کی گاڑی کا انتظام
ہوگیا ہے اور شہر کے لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے شرفاء کے خاندانوں
کی لڑکیاں داخل ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکول کا اعتبار دلوں میں
پیدا ہو رہا ہے۔ خان بہادر سید حسین صاحب سکرٹری خاموشی اور دلسوزی کے ساتھ
مینجری کا کام انجام دے رہے ہیں۔

مدرسہ رفاہ المسلمین لکھنؤ ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ کی جنگ روم روس کے دوران
میں مسلمان مجروحوں کی امداد کے لئے مسلمانان لکھنؤ نے بیس ہزار روپیہ کے قریب
چندہ فراہم کر کے بھیجا تھا۔ اختتام جنگ پر اس جماعت نے مسلمانوں کی مذہبی

تعلیم کی طرف توجہ کی اور ۱۲۹۵ھ میں بصدارت مولوی نظام الدین صاحب فرنگی محلی
یہ مدرسہ بنام رفاہ المسلمین قایم ہوا۔ اس مدرسہ کی متعدد شاخیں سلطان پور میں
اور لکھنؤ کے بعض محلوں میں قایم ہوئیں اور ایک زمانہ میں جناب فخر الہند مولانا محمد
عبدالحی صاحب کے زیر اثر اس مدرسہ نے بہت ترقی کی۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی سب
شاخیں بند ہوگئیں۔ اس وقت اس مدرسہ میں عربی فارسی اُردو اور قرآن شریف
کی تعلیم ہوتی ہے اور مولانا محمد عبدالحی صاحب کا مُرتّبہ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔
تعداد طلبہ ۶۳۔ تعداد مدرسین ۴۔ اور ماہانہ آمد و خرچ تیس روپیہ ماہوار کے قریب ہے
اور کٹرہ ابو تراب میں ایک کرایہ کے مکان میں یہ مدرسہ واقع ہے۔ اس کے کارکن
علاوہ مقررہ تعلیم کے رمضان شریف و عیدین کے مسائل مُرتب کرکے مُسلمانوں
میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور عیدگاہ میں چندہ جمع کرکے عیدگاہ کی ضروریات کا انتظام
بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ حالت میں باعتبار تعداد طلبہ وغیرہ کے اس میں کمی
ہے تاہم باعتبار اپنی قدامت اور تاریخی اہمیت کے یہ مدرسہ اس امر کا مستحق ہے کہ مُسلمانانِ
لکھنؤ اُس کی طرف توجہ کرکے اُس کے فائدہ رسانی کے دائرہ کو وسیع کریں تاکہ
وہ صحیح معنوں میں اکابر علماء کی یادگار کے طور پر قایم رہے اور ترقی کرے۔

مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ — اس مدرسہ میں اگرچہ عربی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے تاہم اُس کی
خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں قرآن شریف اور ابتدائی تعلیم کا
نہایت وسیع پیمانہ پر انتظام ہے۔ مدرسہ میں بکثرت وسیع مکانات ہیں جن میں طلباء

بھرے پڑے ہیں۔اور بڑے انہماک کے ساتھ تعلیم میں مصروف ہیں اور طلبا، کی کثرت اور محویت نے کل احاطہ میں علمی شغف کی ایک ہوا پیدا کر دی ہے۔

ایک طرف تو یہ ہنگامہ اور دوسری طرف جناب فیض مآب مولانا مولوی عین القضاۃ صاحب کی خدمت میں جن کے ذاتی صرف سے یہ عظیم الشان درسگاہ چل رہی ہے حاضر ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک دنیا اور دنیوی امور سے بے تعلقی کا اگر کوئی نمونہ ہو سکتا ہے تو وہ آپ کی ذات والا صفات ہے وہ بزرگ جن کی ذات سے قریب تیرہ سو روپیہ ماہوار کے جیسا کہ سنا گیا ہے تعلیم پر صرف ہوتا ہے نہایت مسکینیت کے ساتھ سادہ کپڑوں میں ایک چٹائی پر تنہا ایک مکان میں تشریف فرما ہیں اور ہمہ وقت یاد الٰہی میں مصروف ہیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ایک ایسے گوشہ نشین بزرگ کی خاموش ذات سے ایک زبردست علمی کارخانہ کس طرح چل رہا ہے۔اس مدرسہ میں ۴۴ اُستاد اور پانسو کے قریب طلبہ ہیں جن کی یومیہ اوسط حاضری ۴۰۰ کے قریب ہے تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناظران قرآن خواں	۱۳۰
حفظ کنندگان	۱۱۲
عربی خواں	۵۷
فارسی خواں	۶۰
متفرقات	۱۴۱
	۵۰۰

متفرقات سے مُراد اُن طلبہ سے ہے جو اپنے حسب منشا مثلاً صرف خوشنویسی یا قرأت

سیکھتے ہیں اور باقاعدہ جماعتوں میں شامل نہیں ہیں اس مدرسہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں دو اُستاد صرف اس بات پر مقرر ہیں کہ وہ ہر روز مختلف کلاسوں کا امتحان لے کر تعلیمی حالت کا برابر اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ سو طلبہ کے قریب ایسے ہیں جن کو کھانا کپڑے کتابوں اور جیب خرچ کی بھی امداد دی جاتی ہے۔ عام مسلمانوں سے کوئی چندہ یا ریاستوں سے بظاہر کوئی امداد نہیں ملتی اور مدرسہ کے کل تعلیمی اخراجات اور متعدد دعوتیں جن کی تعداد سال بھر میں سات کے قریب ہوتی ہے اور جو وسیع پیمانہ پر مسلمانان شہر کو دی جاتی ہیں تمام حضرت مولوی عین القضاہ صاحب کی ذات بابرکات کا اثر ہیں مدرسہ کے تمام رجسٹر نہایت باقاعدہ مرتّب ہیں اور سوائے رجسٹر خرچ و قبض الوصول کے جملہ رجسٹر ہر شخص دیکھ سکتا ہے

تکمیل الطب لکھنؤ یہ مفید انسٹی ٹیوشن طب یونانی کے طلباء کے لئے ایک درسگاہ اور مریضوں کے لئے ایک اسپتال پر مشتمل ہے جس کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عمل جراحی کا عمدہ سامان اور اُس کا انتظام ہے۔ غیر مستطیع مریضوں کا علاج مفت ہوتا ہے اور بلا قیمت اُنھیں دوا دی جاتی ہے۔ چنانچہ سال گزشتہ میں مریضوں کی تعداد ۲۱۵۳۷ تھی جس میں سے ۲۵۰۴ پر عمل جراحی ہوا اور ۳۴۵ موتیا بند کی آنکھیں بنائی گئیں۔ مریضوں کے رہنے کا بھی انتظام ہے مگر سرمایہ کی وجہ سے جگہ کی قلت ہے اسپتال و عمل جرّاحی کے کمرہ کا سامان دیکھنے سے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک انگریزی اسپتال ہے۔ البتہ انگریزی ادویہ کی جگہ یونانی یا دیسی ادویہ استعمال ہوتی ہیں اس اسپتال کی

خوبی عمدگی اور صفائی کی تصدیق ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بڑودہ و صاحب انسپکٹر جنرل شفا خانہ جات صوبہ متحدہ نے اپنے معائنوں میں کی ہے۔ مدرسہ جو اس کے متعلق ہے اُس میں تین سال کا نصاب ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ طلبا عربی کی اصل کتابیں پڑھکر فن طب میں کمال حاصل کریں چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پابندی کی وجہ سے طلبہ کی تعداد سوائے ایک سال کے کبھی ایک سو سے زیادہ نہیں بڑھی اُمید ہے کہ یہ مدرسہ روز افزوں ترقی کرکے اہل ملک کے لئے ایک نعمت ہوگا

انجمن ترقی تعلیم مسلمانان ضلع ڈیرہ غازی خاں

یہ انجمن ۱۹۱۴ء سے آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی لوکل کمیٹی کی حیثیت سے ضلع ڈیرہ غازی خاں میں اشاعت تعلیم کا نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے پہلے دو برسوں میں انجمن نے جا بجا مختلف آبادیوں اور بردرایوں میں جلسے کئے ان کے خیالات کی اصلاح وعظوں اور تقریروں کے ذریعہ سے شروع کی اور ان کو تحصیل علم کا شوق دلایا اور علم کی موجودہ برکتوں نے جو دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے، اس سے ضلع ڈیرہ غازی خاں اور آس پاس کے دیگر اضلاع کے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

مارچ ۱۹۱۶ء میں انجمن نے ایک بہت بڑے جلسہ کا اہتمام کیا جس میں سرحدی صوبہ کے بہت سے ارکان اور شرفا بہت سے قبیلوں کے سردار اور خوانین جمع

ہوئے جناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سابق آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس بھی اس جلسہ کی شرکت کی غرض سے ڈیرہ غازی خاں تشریف لے گئے اور یہ جلسہ بہت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ جلسے میں یہ قرارداد بالاتفاق پاس اور منظور ہوئی کہ انجمن کو خاص طور پر اس امر میں کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اعلیٰ اور سیکنڈری تعلیم میں ڈیرہ غازی خاں کے مسلمان طلبہ کی مدد کرے اور ان کو قرض حسنہ کے طور پر وظائف دیئے جانے کے اہتمام میں اپنی کوشش کو صرف کرے۔

اپریل ۱۹۱۷ء میں مذکورہ بالا مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کارکنان انجمن نے چالیس اصحاب کا ایک بورڈ آف ٹرسٹیز قایم کیا، اس بورڈ میں ایسے اصحاب منتخب کئے گئے جن سے تعلیمی مسائل میں مدد کی توقع تھی ۱۹۱۷ء سے وظائف دیئے جانے شروع کر دیئے گئے اس وقت جو رقم انجمن کے زیر تحویل ہے اس کی تعداد دو ہزار ترانوے روپیہ ہے اور بقدر چالیس روپیہ ماہوار کے انجمن اعلیٰ اور سکنڈری تعلیم کی امداد میں وظیفہ دے رہی ہے اور اس امداد وظیفہ سے نو طالبعلم اسلامیہ کالج لاہور، بھاول پور کالج، ہائی اسکول ڈیرہ غازی خاں، گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ایک وظیفہ مبلغ پندرہ روپیہ ماہوار کا ایسی لڑکی کے واسطے (جو نارمل اسکول علی گڑھ یا گورنمنٹ نارمل اسکول

لاہور میں تعلیم و تربیت پائے منظور کیا گیا مگر باوجود اعلان عام اور چیف انسپکٹر صاحب سے خط و کتابت کے اب تک کوئی درخواست نہیں آئی۔

انجمن کے مستقل پریسیڈنٹ نواب محمد جمال خاں صاحب بہادر تمندار مزاریاں اور وائس پریزیڈنٹ خان بہادر سردار دین محمد خاں صاحب سی آئی ای ہیں قوم کے ان دونوں گرامی قدر اصحاب کو انجمن کے مقاصد سے دلی ہمدردی ہے ہم مولوی دوست محمد صاحب حجابانہ آنریری سکرٹری انجمن کو ان کے عمدہ کام کے مفید نتائج پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اُن کی کوشش اور مسلمانان ڈیرہ غازی خاں کے با اثر اور ہمدرد اصحاب کی توجہ سے جس مفید کام کا آغاز ضلع ڈیرہ غازی خاں کے مسلمانوں میں ہوا ہے اسے روز افزوں ترقی ہوگی اور علم کی روشنی ان کے دلوں اور دماغوں کو منوّر و روشن کر کے رشک ماہ و خورشید بنا دے گی۔

کانفرنس کی لوکل کمیٹیاں

کانفرنس کی یہ بہت پرانی کوششیں ہیں کہ اُس کی شاخ کے طور پر ہر ضلع کے صدر مقام میں تعلیمی کمیٹیاں "لوکل کمیٹی کانفرنس" کے نام سے قایم ہوں اور اُن کا یہ کام ہو کہ وہ اُن وسائل اور تدابیر کو عمل میں لاتی رہیں جس سے اُس ضلع کے

قابل تعلیم مسلمان طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے میں آسانی ہو اور مدد ملے۔

مثلاً وہ اپنے ضلع کے قابل تعلیم مسلمان لڑکوں کی تعلیمی مردم شماری کریں، قابل تعلیم لڑکوں کو ضلع کے سرکاری اسکولوں میں داخل کرانے کی کوشش کریں، اگر اُن کے والدین غفلت کرتے ہیں تو اُن پر اثر ڈالیں اور اُن کو آمادہ کریں کہ وہ اپنے بچّوں کو مدرسہ میں بھیجیں۔

ایسے غریب طالب علم جو کتابوں کے خریدنے اور فیس کے ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ان کو کتابیں اور فیس دے کر ان کی مدد کی جائے۔

ایسے قصبے اور آبادیاں جو صدر مقام ضلع سے دُور ہیں اور جن میں آبادی کے لحاظ سے مدرسے کھولنے کی ضرورت ہے وہاں پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کے مدرسے کھولنے کی کوشش کرنا۔

اس قسم کے اور دیگر فرائض کانفرنس نے تجویز کیے ان کے قواعد کانفرنس نے چھاپ کر تقسیم کیے۔ اکثر اوقات اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے اپنے سفیر بھی اکثر شہروں میں بھیجے، لوکل کمیٹیاں قایم ہوئیں اور انھوں نے اپنے کام کو کانفرنس کی شاخ کے طور پر شروع بھی کیا، مدرسہ کھولنے کی ابتدا بھی ہوئی، وظیفے بھی کسی جگہ دیئے گئے مگر افسوس ہے کہ یہ تمام کام اور ارادے وقتی اور فوری تھے۔ اب بھی کانفرنس کے دفتر میں دس بیس کمیٹیوں کے نام درج رجسٹر ہیں مگر عملی حیثیت سے بجز دو چار کمیٹیوں کے اور سب برائے نام ہیں۔

دوسری طرف جب ہم اپنے برادرانِ وطن کے کاموں کو اور ان کی ملکی اور قومی ترقیوں اور قوتِ مشترکہ کی کیفیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں، اُن کی کارروائیوں میں جو نظم و ترتیب پائی جاتی ہے اتحادِ عمل کی جو قوت نظر آتی ہے، اور جس طرح انھوں نے اپنے مقاصدِ قومی کا ایک مرکز قرار دے لیا ہے اور جس طرح اُن کی تمام طاقتیں اُس مرکز کے گرد گردش کرتی رہتی ہیں اور اپنے محور سے جُدا نہیں ہوتیں، اور جس طریقہ سے اُن کی ضلع وار اور صوبہ وار کمیٹیاں اُن کی کانفرنسوں کو مدد دیتی ہیں اُسے دیکھکر اُن کے حال پر مسرت اور اپنی حالت پر افسوس اور رنج ہوتا ہے۔ ہماری قوتِ عمل میں اگر کوئی چیز کام کرتی ہے تو وہ نکتہ چینی و عیب بینی ہے۔ نکتہ چینی اور اصلاح ہر تحریک کی زندگی اور کامیابی کے لئے لازمی ہیں لیکن اسی کے ساتھ قوتِ عمل میں اتحاد اور اشتراک اس سے زیادہ ضروری ہے خدا ہی کو علم ہے کہ تعلیمی جد و جہد میں اشتراکِ عمل کس دن ہم کو نصیب ہوگا، اور کس دن ہم اس قابل ہوں گے کہ ہماری متفرق اور منتشر تعلیمی قوتیں باہم مل کر عام جہالت کا مقابلہ کریں گی۔

انجمن ترقی تعلیم امرتسر

ہماری قوم میں تعلیمی انجمنیں جو کسی خاص نظام اور خاص اصول کے ماتحت رہ کر کام کرتی ہوں اوّل تو گنتی کی اور اُن میں ایسی انجمنیں جو کامیاب کہی جا سکیں

مشکل سے چار پانچ نکلیں گی۔

ان میں سے جو ترقی "انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرتسر" نے صرف آٹھ برس کی عمر میں حاصل کی ہے وہ قابل آفرین ومبارکباد ہے۔

اس (۸) برس کی مدت میں (۱۹۷) طلبہ انجمن کی امداد سے مختلف صیغہ ہائے تعلیم میں کامیاب ہو کر کاروبار میں مصروف ہیں بہ لحاظ معیار تعلیم اُن کی تعداد حسب ذیل ہے

اسسٹنٹ انجنیر (۸) الیکٹریکل انجنیر (۱) اورسیر (۲) سب اورسیر (۱۷) اسسٹنٹ سرجن (۸) سب اسسٹنٹ سرجن (۱۲) وٹرنری اسسٹنٹ (۳) وکیل و مختار (۸) ایم ایس سی وایم اے (۸) بی ایس سی و بی اے (۵۰) الیف ایس سی والیف اے (۱۵) معلمین (۸) دینیات (۱) زراعتی کالج (۲) جنگلات (۱) تجارتی کالج (۲) شارٹ ہینڈ وٹائپ (۳) حفظان صحت (۱) موٹر ڈرائیور (۱) نقشہ کشی (۳) متفرق صنعتی تعلیم (۶)

اس وقت جو طلبہ انجمن مذکور سے امدادی وظیفہ حاصل کر رہے ہیں اُن کی تعداد (۱۰۲) ہے اور چودہ سو روپیہ ماہوار انجمن اُن پر صرف کرتی ہے۔

جناب شیخ محمد عمر صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا آنریری سکرٹری انجمن ترقی تعلیم امرتسر نے انجمن کے جلسہ میں (جو ۲۳؍ فروری ۱۹۱۷ء کو امرتسر میں منعقد ہوا)

اپنی رپورٹ میں مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی حالت کو حسب ذیل اعداد و الفاظ میں پیش کیا ہی:-

"تمام ملک کی آبادی میں ہم فی صدی ۷ء۲۲ ہیں اور ہندوستان کی گزشتہ تعلیمی رپورٹ کے مطابق ابتدائی تعلیم میں ہماری تعداد ۸ء۲۲ فی صدی ہے جس میں پستی ایسی نمایاں نہیں اگر یہی نسبت آگے بھی قایم رہی تو پھر ساری شکایتیں حرف غلط کی طرح مٹ جائیں لیکن اس سے اگلی منزل پر چل کر جہاں تعلیم کے ساتھ کسی قدر اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں، افلاس کی بدولت ہماری تعداد بجائے ۷ء۲۲ کے (۱۸) فیصدی رہ جاتی ہی اگر ہماری قومی تباہی اسی کمی پر اکتفا کر جائے تو غنیمت ہی، لیکن اور آگے چل کر آرٹس کالج کی تعلیم میں ہمارا حصہ صرف ۲ء۱۱ فی صدی ہی رہ جاتا ہے یعنی نصف سے بھی کم۔ یہ تعداد اگرچہ تسلّی بخش نہیں لیکن پروفیشنل تعلیم میں تو ہماری تعداد اس سے بھی ناگفتہ بہ ہی۔

اس تعلیم میں مسلمانوں کی حالت جس قدر زار و نزار ہے اُس کے واسطے ٹامسن کالج رڑکی کے اعداد نہایت دل شکن ہیں چنانچہ اسسٹنٹ انجینیر کلاس کے (۶۰) طالب علموں میں مسلمان صرف (۳) ہیں اور سیر، سب اوور سیر، مکینکل، اور الیکٹرک انجینیر کلاسوں میں کل مجموعی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہی مگر مسلمان صرف (۵) ہیں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس یعنی انسٹی ٹیوٹ بنگلور میں (۱۳۱) طلبہ میں مُسلمان صرف (۳) ہیں زراعتی کالج پوسہ (بنگال) میں مسلمانوں کی قابل رحم

حالت کمی بیشی کی قید سے بالکل آزاد ہے یعنی صفر، زراعتی کالج لائل پور میں (۵۷) میں (۲۸) مسلمان ہیں اور انجینیرنگ اسکول رسول پور میں منجملہ (۱۰۲) کے مسلمان صرف (۳۲) ہیں فارسٹ کالج دہرہ دون میں (۱۰۱) طلبہ میں صرف (۹) مسلمان ہیں میڈیکل کالج لکھنؤ کے ۳۲ اطلبہ میں سے مسلمان (۷) ہیں لاہور میڈیکل کالج میں (۲۸۵) طالب علموں میں مسلمان صرف (۳۷) ہیں میڈیکل اسکول لاہور میں (۳۴۲) طلبہ میں مسلمان (۹۵) میڈیکل اسکول آگرہ کے ۶۲۷ طالب علموں میں مسلمان صرف (۶۸)

جو اصحاب اس رائے کے حامی ہیں اور جن کا یہ خیال ہو کہ مسلمانوں میں علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا ہی اور اُن کی معقول تعداد ہر علم کی شاخ میں کافی طور سے موجود ہی اور اب اُن کو کانفرنس کے اجلاسوں اور انجمنوں کے جلسوں کے ذریعہ سے شوق دلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی ان اعداد پر غور کریں اور دیکھیں کہ باوصف اس بلیغ کوشش کے جو پچاس برس سے مسلمانوں میں علم کا شوق اور رغبت پیدا کرنے کے لئے کی جا رہی ہے اور ہر سال مختلف صوبوں میں اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جا بجا جلسے بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں مگر نتیجہ میں اس وقت تک ہر جگہ ناکامی نظر آتی ہے اور علم کی وہ شاخیں جو ذہنی اور دماغی قویٰ کی خاص طور پر تربیت کرتی ہیں اُن سے مسلمانوں کے

دماغ بالکل بے نیاز اور دور نظر آتے ہیں کیا قومی تعلیم، دماغی ترقی کی دوڑ میں به لحاظ ان نتائج کے ہمارے تعلیم یافتہ دیگر اقوام کے دوش به دوش چل سکتے ہیں؟ اور کیا وہ وقت اب تک نہیں آیا کہ ہماری قوم کا روشن خیال طبقہ محض تعلیم کے حصول کو قومی ترقی کا ذریعہ سمجھکر پوری قوت عمل سے اس میں مدد کرے۔

انجمن ترقی تعلیم امرت سر کے سالانہ جلسہ میں انجمن کو کامیاب بنانے کے لئے آنریری سکرٹری صاحب انجمن نے پانچ لاکھ روپیہ کی اپیل قوم سے کی ہے۔ منجملہ اس کے جلسہ میں چودہ ہزار روپیہ کا چندہ ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وعدہ ہوا یا نقد روپیہ ملا۔ مستقل سالانہ امداد تین سو روپیہ ماہوار سے ترقی کرکے ایک ہزار روپیہ ماہوار ہو گئی۔

شیخ محمد عمر صاحب سکرٹری کی کامیابی قابل آفریں ہے اس زمانہ میں تعلیم کے واسطے جو کچھ مل جائے غنیمت ہے کیونکہ دیگر ملکی اور قومی ضروریات کے مقابلہ میں اب تعلیم کی ضرورت اگر دوسرے درجہ میں بھی باقی ہے تو قوم قابل مُبارک باد ہے۔

قیمتی ذخیرۂ کُتب کا عطیہ

ہماری قوم میں نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایسے امیر ہیں جو درجہ امارت کے ساتھ علم وفضل کی دولت بھی رکھتے ہیں اور جن میں روشن ضمیری اور قومی ہمدردی کی خاص صفت بدرجۂ کمال موجود ہی جس وقت سے آپ حیدرآباد کا قیام ترک کرکے لکھنؤ میں اقامت گزیں ہوئے، اس وقت سے اب تک آپ کا قیمتی وقت اہل اودھ کی تعلیمی بہبودی کی کوشش میں صرف ہوتا رہا۔ لکھنؤ میں "انجمن تعلیم المسلمین" کو آپ کے اثر اور قابلیت کی وجہ سے بڑی مدد ملی۔

۱۰ مارچ کو خاکسار آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس اودھ پراونشل کانفرنس میں شریک ہونے کو لکھنؤ گیا۔ بر سبیل تذکرہ صدر دفتر کانفرنس میں اُردو فارسی عربی کا جو کتب خانہ قایم ہوا ہی نواب صاحب موصوف سے اُس کا ذکر آیا ممدوح نے فرمایا کہ میری لائبریری میں سے جو کتابیں پسند ہوں وہ موجود ہیں چنانچہ جو کتب میں انتخاب کرسکا نواب صاحب نے نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ اپنے قومی کتب خانہ کو مرحمت فرمائیں ان میں بعض قیمتی اور قلمی کتابیں ہیں بالخصوص دیوان معروف کا قلمی نسخہ جو اب نایاب ہی یہ دیوان نواب آلٰہی بخش خاں معروف کا ہی جو سنہ ۱۲۵۱ھ میں دھلی میں لکھا گیا ہی۔

پرائیویٹ کتب خانوں کے قیام کے متعلق نواب صاحب نے فرمایا کہ وہ اہل ذوق

کی زندگی کے ساتھ ہیں جب اُن کی زندگی ختم ہوئی تو سمجھ لو کہ اُن کے کتب خانہ بھی فنا ہوئے اس لحاظ سے میرا یہ خیال ہے کہ پرائیویٹ کتب خانوں کے محفوظ رکھنے کا اگر کوئی ذریعہ ہی تو وہ قومی کتب خانے ہو سکتے ہیں۔

نواب ذوالقدر جنگ بہادر کا یہ خیال کہ نادر الوجود اور قیمتی کتابیں معتبر پبلک کتب خانوں میں زیادہ محفوظ طریقہ سے قرنہا قرن تک رہ سکتی ہیں نہایت قابل قدر ہی اور ہمیں یقین ہے کہ جس مبارک سلسلہ کی ابتداء شروع ہوئی ہے وہ برابر جاری رہے گا اور ہماری قوم کے علم دوست اصحاب اس بہترین خیال کی تقلید فرمائیں گے اور وقتاً فوقتاً اس قومی لائبریری کو عطیہ کتب سے مثل نواب صاحب موصوف کے ہم کو شکرگزاری کا موقع دیں گے

سفیران کانفرنس

سالانہ رخصت سے مستفید ہونے کے بعد سید مظفر حسین صاحب حکیم مظفر حسین صاحب سید فیض الحسن صاحب منشی محمد ناظم صاحب منشی محمد حسین صاحب شوق سفرا صدر دفتر میں حاضر ہوئے اور ۱۵ مارچ سے سید مظفر حسین صاحب (صوبہ بہار) میں سید فیض الحسن صاحب (صوبہ پنجاب) میں منشی محمد حسین صاحب شوق (اودھ) میں حکیم مظفر حسین صاحب اور منشی محمد ناظم صاحب (صوبہ متحدہ) کے ضلع سہارنپور اور ضلع فرخ آباد میں تعینات کئے گئے تاکہ تعلیمی خدمات انجام دیں۔

مذکورۂ بالا تمام سفیر صاحبان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اشاعت تعلیم کا کام انجام دیں جن کی تفصیل خدمات حسب ذیل ہے۔

(۱) کانفرنس کی لوکل کمیٹیاں قائم کرنا، جہاں پہلے سے قائم ہوں اُن میں از سر نو عملی تحریک پیدا کرنا۔

(۲) جو اسلامی انجمنیں پہلے سے قایم ہوں اُن کو مقاصد کانفرنس کی تائید اور قبول کرنے پر آمادہ کرنا۔

(۳) صوبہ ممالک متحدہ کے اضلاع سے اسپیشل اسلامیہ اسکول و مکاتب کی درخواستیں بھجوانا۔

(۴) لوکل کمیٹیوں کو حسب ذیل کاموں کی طرف متوجہ کرنا اور کمیٹی کو خود بھی مدد دینا

(الف) اپنے ضلع یا مقام میں غیر مستطیع طلباء کو فیس یا کتابیں یا دیگر قسم کی امداد دینے کے لئے سرمایہ فراہم کریں۔

(ب) سرکاری مدارس میں طلباء کو داخل کرنے کی کوشش کریں۔

(ج) جہاں ضرورت ہو مڈل اسکول قایم کریں۔

(د) بحالت ضرورت سرکاری مدارس میں معافی فیس کی کوشش کریں۔

(ہ) ورنیکلر فائینل یا ورنیکلر مڈل پاس طلباء کو نارمل اسکولوں میں داخل ہونے کی ترغیب دیں اور اُن کے داخلہ اور تعلیم میں ضروری مدد دیں۔

(و) مسلمان طلباء کو سرکاری مدارس کے داخلہ یا نارمل اسکول کے داخلہ میں

جو رکاوٹیں پیدا ہوں اُن کی اصلاح کی کوشش کریں اور اس کی اطلاع صدر دفتر کو دیں۔

(۱۰) تمام سفیر اپنی کارگزاری کی رپورٹ اور نقشہ ہفتہ وار صدر دفتر کو ارسال کرتے ہیں۔

مذکورۂ بالا مقاصد کے ساتھ سفیران کانفرنس کے کام کی کامیابی مقامی بااثر اور ہمدردِ تعلیم اصحاب کی توجہ پر بہت کچھ منحصر ہے۔

جو سفیر جس مقام میں کام کریں گے وہ گویا اس مقام کے اصحاب کی سپرد اس غرض سے کانفرنس نے کئے ہیں کہ وہ ان سے تعلیمی خدمت کا کام لیں، سفیروں کی مدد فرمائیں، اپنے اپنے مقام پر مسلسل تعلیمی کام کرنے والوں کی جماعت طیار کریں، جو کانفرنس کی شاخ کے طور پر "لوکل کمیٹی کانفرنس" کے نام سے ہمیشہ تعلیمی خدمت انجام دیتی ہے۔ یہ جماعت اپنی رائوں، مشوروں، اور ضرورتوں سے صدر دفتر کانفرنس کو اطلاع دے اور دفتر مذکور سے تعلقات اور ارتباط کو قایم رکھنے کی کوشش کرے، جہاں مدرسہ کھولنے کی ضرورت ہو وہاں مدرسہ کھولا جائے، جہاں اپنے ضلع کے غیر مستطیع اور غریب طالب علموں کو مدد دینے کی ضرورت ہو، اُن کی مدد کے لئے وظیفہ فنڈ قایم کیا جائے۔ غرض کانفرنس تعلیم کی خدمت اور تعلیم کی اشاعت کے حتی الامکان وسائل اور طریقے اختیار کرتی رہی ہے اور آیندہ کرے گی۔ لیکن قومی اور پبلک بہبودی کی تجاویز میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے قومی مدد اور توجہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اگر

دونوں قوتیں ساتھ مل کر کام کریں اور ایک دوسرے کی اعانت پر آمادہ ہوں تو وقت محنت اور روپیہ کا صرف تینوں چیزیں ٹھکانہ لگ سکتی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ مسلمان بہ حیثیت قوم کے اپنی تعلیم کی اشاعت اور مدد کرنے میں پھر تیزی کے ساتھ قدم بڑھانے کی کوشش کریں گے کیونکہ موجودہ حقیقت اس امر کو صاف ظاہر کر رہی ہے کہ ہم آگے چلنے کا کوئی بھی رستہ اختیار کریں لیکن منزل مقصود پر بغیر قابلیت کے پہونچنا معلوم۔ اب اس زمانہ میں قوموں کا سوال نہیں ہے بلکہ قابلیت کا سوال ہے۔ قسمتوں کی آزمایش کا زمانہ ہو چکا + ہے پس اب یاں غیرتوں اور ہمتوں کا امتحان

وہ اور ہم

ذیل میں مسلمانوں کی تعلیمی اور قومی مجالس کی کارروائیوں کا دیگر اقوام ہند کی تعلیمی کانفرنسوں اور سبھاؤں کے کارروائیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے گوروکل کانگڑی اور سکھ تعلیمی کانفرنس کے گزشتہ جلسوں کے جو حالات درج کئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ہماری قوم کے بزرگ غور کے ساتھ ان کا مطالعہ فرمائیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ہماری ہمسایہ قومیں تعلیمی میدان میں کیا کر رہی ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں

گوروکل کانگڑی کا مقصد زبان سنسکرت اور ویدک تہذیب کا احیا ہے۔ اس مقصد اسے بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ سنسکرت جس کو بحر فراموشی میں غرق ہوئے مدتیں گذر گئیں گوروکل میں زندہ کی جا رہی ہے کالج کے برہمچاریوں نے مختلف مضامین پر سنسکرت میں اس تیزی و روانی و فصاحت و بلاغت کے ساتھ تقریریں کیں کہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے رکن ڈاکٹر میڈلر (پرنسپل لیڈز یونیورسٹی انگلستان) کو جو جلسہ میں تشریف فرما تھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا۔

"میرا خیال تھا کہ سنسکرت ایک مُردہ زبان ہے۔ جو کبھی زندہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن گوروکل میں آکر برہمچاریوں کو جس تیزی اور صفائی سے سنسکرت بولتے دیکھا ہے۔ اس سے میں نے یہ رائے قایم کی ہے کہ سنسکرت ایک زندہ زبان ہے"۔

انھوں نے یہ بھی فرمایا۔ کہ "آپ سنسکرت کو اپنی بھاشا بناتے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں آپ جائیں گے یہ آپکے ساتھ جائے گی"۔

فارغ التحصیل طلبہ کو اچاریہ جی نے ڈگریاں عطا کرتے ہوئے بیش قیمت نصائح کیں اس کے جواب میں ایک فارغ التحصیل طالب العلم نے تقریر کرتے ہوئے کہا "آریہ جاتی نے ہم پر احسان کیا۔ ہم اُس کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اے خدا۔ طاقت دے۔ کہ ہمارے اندر آریہ جاتی کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ جہاں ان کا پسینہ بہے گا ہم اپنا لہو بہائیں گے۔ جہاں ان کا لہو بہے گا۔ ہم اپنی جان دیدیں گے۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے عہد کو پورا کریں"

سوامی سیتانند نے طلبہ کو الوداع کہتے ہوئے کہا "خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کو کوئی تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ دُکھ اُس کے پاس نہیں آتا۔ مصیبتوں کے پہاڑ سر پر جھکا دیتے ہیں۔ تمہاری زندگی اُن بادلوں کی طرح ہونی چاہیے جو آسمان سے برس کر زمین کو تر کر دیتے ہیں۔ اندھیرے میں بجلی کی طرح چمک کر تاریکی کو دُور کر دو"۔ آریہ جاتی کے جوانمرد۔ جری۔ شجاع فرزندان اعلیٰ جذبات کے ساتھ تاریکی کو دُور کرنے کے لئے گوروکل سے

رخصت ہونگے اور ہم انھیں دیکھیں گے کہ وہ اپنی قوم کے لئے کیسے سود مند ثابت ہوتے ہیں جلسہ میں چندہ کی مقدار ۶ ہزار تک پہنچ گئی۔ اور ان نتائج سے دلوں کو یہاں تک مسخر کیا کہ سیٹھ رکھومل نے ہندو لڑکیوں کے لئے بھی ایک گوروکل کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اور تجویز کو عملی لباس پہنانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ نقد اپنی جیب سے دیا۔ جس میں ۷۰ ہزار کا اسی وقت اضافہ ہوگیا۔

اس سے دوسرے نمبر پر سکھ کانفرنس ہے جس کا اجلاس گوجرانوالہ میں ہوا ہے۔ اس چھوٹی سی قوم نے کانفرنس کے ذریعہ سے اب تک کیا کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ گزشتہ دس سال کے زمانہ میں ½۱ لاکھ کی رقم قومی سکولوں اور آشرموں کے لئے حاصل ہوچکی ہے۔ اس وقت سکھوں کے ۷ کالج ۲۲ ہائی سکول ۸۳ مڈل سکول (جن میں سے ۹ لڑکیوں کے لئے ہیں) ۲۴۸ ابتدائی سکول (جن میں سے ۱۲۰ لڑکیوں کے لئے ہیں) ایک کنیا مہا ودیالہ ایک بڑا زنانہ ہوسٹل ۲ پرچارک ودیالہ ایک بیواؤں کا آشرم ۶ بورڈنگ ہوس ۵ یتیم خانے ۷ امدادی شعبے جاری ہیں۔ شرکائے کانفرنس کی تعداد ۱۵ ہزار سے کم نہ تھی سکھوں کی اس قدر عظیم الشان تعداد نے ایک ہی جگہ کھانا کھایا۔ ان میں کونسلوں کے ممبر تھے۔ مذہبی پیشوا تھے۔ ڈپٹی تھے، بیرسٹر تھے، تاجر تھے، مکھ پتی دولتمند اور بے نوا محتاج تھے۔ لیکن کسی کے لئے علیحدہ کمرے تلاش نہیں کئے گئے۔ نہ کسی کے لئے کوئی خاص امتیاز روا رکھا گیا (جو آج کل مسلمانوں کا شیوہ ہے) لطف یہ ہے کہ کھانے پینے کا تمام سامان فیاض سکھوں نے فراہم کردیا تھا اور کھانا کھلانے والے دو سو معزز سکھ تھے۔

گورونانک کالج گوجرانوالہ کے لئے اپیل کی گئی تو ۴۰ ہزار روپیہ نہایت قلیل وقت میں جمع ہوگیا۔ نیشنل فنڈ کے لئے ۲۰ ہزار وصول ہوا ۳۰ ہزار کی رقم ٹکٹوں کی فروخت سے سکھ کانفرنس کے اراکین کو اور ۲۵ ہزار کی رقم اسی مد میں استقبالی کمیٹی کو حاصل ہوئی یعنی چندہ کی کل مقدار سوا لاکھ تک پہنچ گئی

کانفرنس میں قومی ترقی کے لئے نہایت اہم ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ بیت المال کے لئے تجویز ہوا کہ ہر ایک سکھ اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ یا کم از کم سوا روپیہ سالانہ چندہ دے۔ اسی قدر رقم لڑکوں کے تولد ہونے کے موقع پر عطا کرنی ہر ایک سکھ کے لئے لازمی قرار دی گئی۔

کانفرنس میں تمام تقریریں پنجابی میں کی گئیں۔ سردار ہرنیں سنگھ رئیس اٹاری نے کہا "ہمارے گورو مہاراج کا حکم ہے کہ ایک سکھ سوا لاکھ اور سوا لاکھ سکھ ایک ہے۔ تمام سکھوں کو اپنے آپ کو ایک سمجھنا چاہیئے۔ اور ذات پات کی قید بالکل اڑا دینی چاہیئے۔ جب کوئی شخص سکھ بن گیا تو پھر کھتری کیا۔ جاٹ کیا۔ اور اروڑہ کیا۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سکھ ہے۔" یاد رکھنا چاہیئے کہ سکھوں کی تعداد پنجاب میں چند لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح گوروکل کانگڑی کے حامیوں کی تعداد بھی چند ہی لاکھ پر مشتمل ہے۔ بایں ہمہ وہ اپنے ہر جلسہ پر لاکھوں روپیہ جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ ہم ندوۃ العلما لکھنؤ اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں اول الذکر جلسہ کی مختصر روداد آپ ان کالموں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہمیں مفصل کیفیت تو معلوم نہیں ہے۔ لیکن جو حالات اب تک ہمیں معلوم ہوئے ہیں اور جن حالات کی سالہائے ماسبق کے اجلاسوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے توقع ہوسکتی ہے۔ وہ چنداں حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ حمایت اسلام کے جلسہ کی کیفیت بھی کچھ امید افزا نہیں ہے حاضرین جلسہ کی تعداد تمام سالہائے ماسبق سے کم تھی اور چندہ کی مقدار اتنی تھی کہ اس سے مستقل سالانہ اخراجات کا دسواں حصہ بھی تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا۔ اس میں ڈھائی ہزار روپیہ صاحب صدر کا تھا۔ ایک ہزار آنریبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹر کا ½۱ ہزار طلبہ نے جمع کیا اور دس گیارہ ہزار کے قریب متفرق طور پر وصول ہوئے۔ یعنی ۱۵ ہزار روپے کی رقم فراہم ہوئی۔ حالانکہ انجمن کا سالِ نو کا بجٹ بوجہ تعمیرات ضروری تقریباً چار لاکھ روپے تک پہنچتا ہے۔ گو یہ خرچ بفضلِ خدا کسی نہ کسی طرح پورا ہوگا مگر یہ کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ جبکہ قلیل التعداد جماعتیں اپنے قومی کاموں میں اس قدر سرگرمی اور زندہ دلی کا اظہار کرتی ہیں۔ مسلمان روز بروز مردہ دل ہوتے جاتے ہیں جو روح ہندوؤں اور سکھوں سے اس قدر کام لے رہی ہے۔ مسلمانوں میں مفقود ہے اور یہ فقدان احساس نہ صرف ان کی قومی مجالس میں نمایاں ہے۔ بلکہ قومی درسگاہوں میں بھی موجود ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

حصہ دوم

۱۔ اسلامی تعلیم گاہوں کی عام حالت، ان کے انتظامی نقائص اور اصلاح کی تدابیر } از مسٹر ذاکر حسین خاں متعلم بی اے کلاس محمڈن کالج علی گڑہ۔

اسلامی تعلیم گاہوں کی عام حالت، ان کے انتظامی نقائص اور اصلاح کی تدابیر

کے عنوان سے صدر دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے پچھلے سال انعامی مضامین لکھے جانے کا اعلان کیا تھا۔ مذکورہ بالا سبجیکٹ پر اکثر اصحاب نے غور کیا اور نہایت محنت اور کاوش سے مضامین لکھے۔ ایک منتخب کمیٹی ان پر غور کرنے اور انعام تجویز کرنے کے لیے بیٹھی۔ سب سے اول درجہ کا مضمون مدرستہ العلوم علی گڑہ کے ہونہار طالب علم مسٹر ذاکر حسین خاں متعلم بی اے کلاس و وائس پریسیڈنٹ سدرم یونین کلب نے لکھا، اور مسٹر موصوف کو سو (۱۰۰) روپیہ کا انعام مضمون لکھنے کے صلہ

میں کانفرنس کی طرف سے دیا گیا۔

انعامی مضمون کا عنوان نہایت اہم اور قومی توجہ کا محتاج ہی جس کے حل ہونے پر ہماری قومی اور تعلیمی مشکلات کے آسان ہونے کا انحصار ہی۔

انعامی مضامین کو غور کے ساتھ پڑھنا ہر اُس مسلمان کا فرض ہی جس کو مسئلۂ تعلیم سے دلچسپی اور ہمدردی ہی۔ ہم ان تمام مضامین کو سلسلہ وار کانفرنس گزٹ میں چھاپینگے سب سے پہلے مسٹر ذاکر حسین کا تحریر کیا ہوا مضمون چھاپا جاتا ہی جو با اختتام سلسلہ کے ساتھ شایع ہوتا رہیگا۔

حَاسِدًا وَّمُصَلِّیًا

تمہید

عِلم الکیمیا کے تجربات نے ثابت کر دیا ہی کہ جب دو مختلف المزاج چیزیں ایک خاص تناسب کے ساتھ باہم ملائی جاتی ہیں تو دونوں کا اتحاد و امتزاج ایک ایسی تیسری چیز پیدا کر دیتا ہی جو اپنے اجزاے ترکیبی سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ ورنہ صرف اُس کی کیفیتِ جسمانی اور صورتِ ظاہری بلکہ تمام افعال و خواص ہی کسر و انکسار کے بعد ایک بالکل جداگانہ نوعیت اختیار کر لیتی ہیں۔ در حقیقت یہ ہی کہ اس نگارخانۂ ہستی کی حیرت انگیز رنگا رنگی اور نادرہ کار بوقلمونی اس قانونِ ترکیب کی سحر آفریں صناعی کا نتیجہ ہی۔ کسر و انکسار کا یہ عالمگیر قانون

صرف دنیائے جمادات تک منحصر نہیں ہی بلکہ نباتات وحیوانات اور خود نوع انسان باایں ہمہ دعائے خلافتِ ارضی اس ناموسِ فطرت سے ایک سرمو تجاوز نہیں کرسکتی اور نہ صرف دو افراد کا باہمی میل جول اور تبادلہ خیالات دونوں کے تخیلات دماغی اور طرزِ معاشرت میں ایک جدید تغیر کا باعث ہوتا ہی بلکہ اقوامِ مختلفہ کا باہمی تعلق خواہ وہ سیاسی ہو یا تجارتی، زمانی ہو یا مکانی، اخلاقی ہو یا علمی دونوں قوموں کی معاشرت اخلاق و تمدن پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا اور باہمی فعل وانفعال تاثیر و تاثر کے بعد جو کیفیت پیدا ہوتی ہی وہ مفید ہو یا مضر حالت ماقبل سے مختلف ضرور ہوتی ہی۔ چنانچہ ہندوستان جو ہمیشہ سے اقوام فاتحہ کا جولانگاہ رہا ہی اس قانون کا ایک دلچسپ مرقع ہی۔

سکندرِ اعظم کا حملہ اگرچہ برق و باد کی طرح ایک فوری واقعہ تھا تاہم تاریخ ہندوستان پر اُس نے ایک محسوس و پایدار اثر چھوڑا ہی۔ یوں ہی کشورکشایانِ اسلام کی فتوحات اور پھر مختلف حصصِ ہند میں اسلامی حکومتوں نے عرب، ایرانی، مُغل اور ہندوستانی اقوام کو اس طرح باہم مختلط کردیا تھا جن کے امتزاج نے ایک بالکل ہی نیا تمدن پیدا کردیا۔ سب سے آخر میں دولتِ برطانیہ کا پرچمِ اقبال اس سرزمین پر لہرایا اور اس طرح پر دو مختلف الخیال مختلف المذاہب اور مختلف المعاشرت جماعتوں کے باہمی تصادم نے ہندوستان کے عمرانی حالات میں معتد بہ انقلابات پیدا کردئیے ہیں اور یہاں کے تمدن کو جو پہلے ہی سے دوآتشہ تھا سہ آتشہ کردیا ہی۔

ان جدید حالات میں بقائے قومی کے لیے ایک ایسا جدید دستور العمل ناگزیر ہی جو

حالاتِ متغیرہ سے مطابق ہو ورنہ علم الحیات کا قانون "بقائے اصلح"
(Survival of the fittest) پُرانی لکیر کے فقیروں کو ہر ہر قدم پر پیغام فنا دیتا ہے
اس لیے اقوامِ ہند کے دماغ میں قدرتی طور پر بہت سے جدید عمرانی سوالات پیدا ہو گئے ہیں
جن کے تشفی بخش حل کے لیے بہت کچھ دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات کی ضرورت ہے کیونکہ
جس طرح عجائب خانۂ آفرینش میں انسان کا وجود سب سے زیادہ اہم، پیچیدہ، ناقابلِ ادراک
اور بقول غالبؔ بجائے خود ایک محشرِ خیال ہے اسی طرح بعینہٖ تمام علوم و فنون میں وہ علوم
زیادہ دقیق اور معرکۃ الآرا ہیں جو انسان کی انفرادی حالت یا اجتماعی نظام سے
بحث کرتے ہیں۔

ہم اس وقت جس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانانِ ہندوستان کا مسئلہ تعلیم ہے۔ تعلیم
کی ضرورت اور اہمیت ایک مسلمہ امر ہے لہٰذا اس کے متعلق کچھ لکھنا ایک فرسودہ اور پامال خیال
کا اعادہ ہے۔ ہاں تعلیم کی نوعیت اور اُس کی اشاعت کے طرق البتہ مابہ النزاع ہیں اور چونکہ
طرقِ اشاعت بہت کچھ نوعیتِ تعلیم پر منحصر ہے لہٰذا سب سے پہلے ہم اسی کا تصفیہ کر دینا چاہتے
ہیں لیکن خود نوعیتِ تعلیم کا انحصار اُن مقاصد پر ہے جن کے لیے حصولِ تعلیم بطور ایک آلہ
یا وسیلہ کے قرار دیا جاتا ہے۔

قدیم حکمائے یونان تو تعلیم کو بجائے خود ایک اہم ترین مقصدِ انسانی سمجھتے تھے لیکن
اگر عام فطرتِ انسانی کا تفحص کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائیگی کہ ایسی ہستیاں دنیا میں شاذ و
نادر ہونگی جو علم کو محض علم کے لیے حاصل کرنا چاہتی ہوں اور کوئی دینی یا دنیوی مقصد اُن کے

پیش نظر ہو۔ مسلمانان ہند کی موجودہ چہل سالہ تعلیمی جدوجہد کا مطمح نظر بھی محض ادراک معارف وحقائق نہیں ہی بلکہ اقتصادی اور سیاسی فوائد بھی ہیں جن پر ہم مختلف عنوانوں کے تحت ذیل میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

تعلیم کے مقاصد

مغربی اقوام نے قرون وسطیٰ کے بعد کرۂ ارض پر جو سیاسی اقتدار حاصل کرلیا ہی خواہ اُس کی اور بھی ناگزیر عمرانی اسباب رہے ہوں لیکن عموماً اہلِ نظر کی یہ رائے ایک بڑی حد تک صحیح ہی کہ یورپ کی موجودہ مادی ترقی اُس کے ارتقاے علمی کا نتیجۂ لازمی ہی۔ اس لیے ممالک مشرقی کی تمام نیم بیدار قوموں میں اکتسابِ علومِ جدیدہ کا شوق پیدا ہوگیا ہی اور ہندوستان میں تو دولتِ برطانیہ کی فرمانروائی نے اس تحریک کو بقاے قومی کے لئے ناگزیر کردیا ہی۔ کیونکہ ایک طرف تو رعایا اور حکمراں کے تعلقات کا استحکام بہت کچھ باہمی تفہیم وتفہم پر منحصر ہی اور دوسری طرف خود رعایا میں اختلاف مذہب وقومیت نے ہندوستان کو کشاکشِ باہمی اور مسابقت قومی کا ایک محشرستاں بنادیا ہی۔

ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی قدرتی طور پر اس امر کے آرزومند ہیں کہ مناصبِ دولتی میں اُن کو کافی حصہ ملے اور بارگاہِ سلطنت میں دوسری قوموں سے زیادہ رسوخ حاصل کرسکیں۔ علاوہ بریں مشرق ومغرب کے تصادم نے جو جدید تمدن پیدا کردیا ہی اُس نے زندگی کے ہر شعبہ اور حصولِ معاش کے ہر طریقہ کے لیے کم سے کم حرف آشنا ہونا لازمۂ حیات بنادیا ہی۔ اور در و دیوار سے یہ صدا آرہی ہی کہ ؎

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا نہ زرگر اور نہ آہنگر نہ بازیگر نہ سوداگر

یہ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر تمام اقوامِ ہند کے تعلیمی مساعی کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

مقاصدِ مشترکہ



(۱) عام سیاسی تفوق اور اقتصادی ترقی۔

(۲) سرکاری ملازمتیں۔

(۳) ارتقائے دماغی میں اقوامِ متمدّنہ کی ہمسری۔

مقاصدِ مخصوصہ

ان مشترک مقاصد کے علاوہ ہر قوم کے کچھ الگ مخصوص مقاصد بھی ہیں۔

حکماء کی رائے ہے کہ افراد کی طرح اقوام بھی ایک طرح کا "نظام نامی" (Living organism) ہیں کیونکہ جس طرح افراد کی صحت و بقا کے لیے یہ ضرور ہے کہ تمام ذرّاتِ جسم میں تجاذب ہو، تشخصاتِ ذاتی قایم رہیں، تمام قوائے ظاہری و باطنی اعتدال کے ساتھ یکساں طور پر نشو و نما پائیں بجنسہ اسی طرح بقائے ملّی اور ارتقائے قومی کے لیے ناگزیر ہے کہ افرادِ قومی میں اتحاد اور انجذاب ہو، قوم کی خصوصیاتِ تاریخی اور روایاتِ ملّی زندہ ہوں۔ حیاتِ اجتماعی کی جتنی حیثیات ہیں خواہ وہ علمی ہوں یا اخلاقی

اقتصادی ہوں یا سیاسی سب میں یکساں ترقی ہو لہذا مسلمانانِ ہند بحیثیت ایک قوم کے جو کچھ بھی اپنا تعلیمی نصب العین متعیّن کریں اُس میں امور مندرجۂ ذیل کا لحاظ ضروری ہوگا:

احکامِ مذہبی کی تلقین اور اخلاقِ اسلامی کی تربیت۔

روایاتِ ملی کی اشاعت اور ادب و انشائے قومی کا ارتقا۔

اِن چند سطور نے غالباً یہ بات ظاہر کردی ہوگی کہ کس قسم کی تعلیم ہمارا مقصود ہی۔

اب صرف یہ دیکھنا ہی کہ بحالاتِ موجودہ ان تمام مقاصد کا حصول کس طرح پر ممکن ہے اور وہ کون طریقہ ہی جس کے ذریعہ سے ہم اپنے منشاء کے موافق جماعتِ اسلامی میں تعلیم کی اشاعت کر سکتے ہیں۔

حصولِ تعلیم کی دقّتیں

تعلیم کی گرانی اور مسلمانوں کا عالمگیر افلاس دیکھتے ہوئے اسلامی مدارس کی موجودہ قلیل تعداد بھی ہمیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہی مگر اُن کی بدنظمی ارکانِ انتظامیہ کی باہمی مخالفت، سرمایہ کی کمی اور نتائجِ امتحان کا ناخوشگوار منظر دیکھکر تمام حوصلے قومی حالت کی طرح پست اور اُمیدیں دلِ دردمند کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں۔

یہ ظاہر ہی کہ مقاصدِ پنجگانہ مذکورہ بالا کا حصول مجموعی طور پر بہت مشکل ہی کیونکہ اصلی مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمارے سامنے جو ذرایع موجود ہیں مثلاً سرکاری اسکول اور کالج اُن میں اوّلاً تو گنجایش کم ہی اور اگر بالفرض وہ مسلمان طلبہ کے لیے کافی بھی ہوں تو بھی

چونکہ اُن میں مذہبی تعلیم اور قومی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہی اس لیے ایک اہم ترین مقصد تعلیم جس پر بہت کچھ بقائے قومیت کا مدار رہتا رہا جاتا ہی۔ رہے مشن اسکول اور کالج وہ اس نقطہ نظر سے اور بھی زیادہ ناکارہ ہیں کیونکہ اُن میں صرف ایک ضروری پہلو کی کمی ہی نہیں ہی بلکہ ایک مستقل خرابی کا اضافہ بھی ہی اور طلبا نہ صرف مذہبی تعلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں بلکہ اپنے مذہب کی طرف سے اُن کے دل میں شکوک اور اوہام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہی اور ترکِ مذہب کے لیے ہزاروں قسم کے دلفریب کھلونے پیش کیئے جاتے ہیں۔ اِن حالات میں یا تو ہمیں خطرات سے بے پروا ہونا پڑیگا یا فوائد سے محروم رہنا۔

دوسری دقّت جو اشاعتِ تعلیم میں ہی وہ مسلمانوں کی مسلّمہ بے مایگی ہی۔ اس میں شک نہیں کہ قوم میں عام طور پر روشن خیال اور مخلص ہمدردانِ ملّت کی کافی تعداد موجود ہوتی تو اس نقص کی تلافی بہت کچھ ممکن تھی مگر افرادِ قوم میں ان اخلاقِ حسنہ کا پیدا ہونا بجائے خود بہت کچھ اشاعتِ تعلیم پر منحصر ہی اور تعلیم سرمایہ پر مبنی ہی۔ ہم اس کے ماننے کے لیئے تیار ہیں کہ ابتدا میں بیشک مسلمانوں نے علوم جدیدہ کی طرف سے استغنا برتا اور مدت تک انگریزی تعلیم کو الحاد اور زندقہ کا مرادف سمجھتے رہے۔ مگر اوّلاً تو قرنِ سیزدہم کے مصلح اعظم سرسید علیہ الرحمہ اور اُن کے مخلص جاں نثاروں کی مُسلسل مساعی نے اور ثانیاً خود زمانہ کے زبردست ہاتھوں نے ان اوہامِ باطلہ کا طلسم بالکل توڑ دیا ہی اور غالباً جماعتِ اسلامی میں اب ایک بھی ایسا متنفس نہ ملیگا جو اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلانا کفر سمجھتا ہو۔ یہ اور بات ہی کہ حد سے زیادہ تموّل اور انتہا سے زیادہ افلاس اس شوق کے پیدا ہونے کا موقع ہی

نہ دیتے ہوں۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آج سے چالیس سال پیشتر جہاں سے سر سید پر کفر کے فتوے صادر ہوتے تھے اب وہیں سے مسلم یونیورسٹی کے لیے چندے وصول ہوتے ہیں اور خیر سے اب تو یہاں تک نوبت پہونچی ہے کہ سادات بارہہ و بریلی اور علماے دیوبند اور فرنگی محل کا خاندان بھی انگریزی مدارس میں دکھائی دینے لگا ہے لیکن تعلیم کی اس ہر دلعزیزی سے اُس کی عموم اشاعت کا نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی تہی دستی تعلیم کی گرانی کے ساتھ ساتھ روزافزوں ترقی کر رہی ہے۔ اور حصولِ تعلیم کے راستہ میں کچھ یونیورسٹی کی سختیوں اور کچھ برادرانِ وطن کی مہربانیوں سے اور بھی نئے نئے موانع پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لہذا بحالتِ موجودہ رہبرانِ قوم کے لیے سب سے زیادہ حل طلب سوال یہ ہے کہ تعلیمی ضروریات کے لیے جو سرمایہ بھی اربابِ ثروت کی فیاض دلی سے اس وقت میسر آسکتا ہے اُس کا بہترین مصرف کیا ہے اور وہ کونسا طریقہ ہے جس سے کم سے کم صرف میں زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں بظاہر دو طریقے معلوم ہوتے ہیں ایک اسلامی درسگاہوں کا قیام، دوم وظائف کے ذریعے سے غریب طلباء کی امداد۔ ان میں سے دوسرا طریقہ بوجوہ ذیل زیادہ کارآمد معلوم ہوتا ہے۔

اجراے مدارس کے متعلق اعتراضات

(۱) قومی مدارس کے قیام کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے اور جو رقم عمارات و اسبابِ ضروریہ کے تہیہ میں صرف ہوگی اُس سے کوئی معتدبہ اور فوری فائدہ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں چونکہ سرمایہ کا کثیر حصہ اسٹاف کی تنخواہ اور دیگر مصارفِ ضروریہ

میں خرچ ہو جاتا ہے اس لیے غریب طلباء کو کافی وظائف نہیں ملتے اور وہی لوگ تعلیم پاتے ہیں جو خود اپنی کفالت آپ کر سکتے ہیں اس لیے قومی مدارس کے قیام سے کوئی معتد بہ مادّی فائدہ نہیں ہے۔

(ب) قومی مدارس میں اگر معلّمین مسلمان نہیں ہیں تو اُن کا قیام فضول ہے اور اگر مسلمان اساتذہ کا تقرر لازم سمجھا جائے تو کمی تعلیم کی وجہ سے حسب منشا اُن کا ملنا مشکل ہے اور جو ملتے بھی ہیں تو بہت زیادہ مشاہرہ پر۔

(ج) درس گاہوں کا قیام اس قدر دشوار نہیں ہے جس قدر اُن کا کامیابی کے ساتھ چلانا مشکل ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی درسگاہیں ابتدائی حالت میں رہتی ہیں اُس وقت تک ایسے مخلص آدمیوں کا ملنا بہت مشکل ہے جو قومی مفاد کے لیے اپنی اوقاتِ عزیز کا صرف کر سکے اور باعتبار تموّل و وجاہت اُن کی حالت ایسی ہو کہ قوم اُن پر اعتبار کر سکے اور اگر کوئی خدا کا بندہ ایسا مل بھی گیا جس کے ایثار اور قومی جوش کی بدولت ایک قومی درسگاہ مستحکم بنیاد پر قایم ہو گئی اور اُس کا کام چل نکلا تو جاہ طلب حضرات کا ٹڈی دَل بُری طرح ٹوٹ پڑتا ہے آخر الامر باہمی کشاکش شروع ہو جاتی ہے اور بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے گزشتہ چند سالوں میں جا بجا نے کتنے اسلامی مدارس قایم ہوئے۔ مگر آخر میں ہمیں کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کا مرثیہ پڑھنا پڑا۔

یہ اسباب ہیں جن کی بُنیاد پر بعض اہل الرائے کا قول ہے کہ " کردن صد عیب نکردن یک عیب"۔

سرپرست قومی مدارس کے قیام سے کہیں بہتر ہی کہ نادار طلباء کے مصارفِ
تعلیم کی کفالت کی جائے اور جس طرح یورپ میں ایک متوسط الحال کنبہ کے لیے کفایت
شعارانہ طریق زندگی یہ ہی کہ کرایہ کے مکان اور بازار کی رڈیوں پر بسر کرے۔ مطالعہ کا
شوق ہو تو کتابیں خریدنے کے بجائے پبلک لائبریری کا ممبر ہو جائے۔ اسی طرح سے
مسلمانوں کی اقتصادی اور اخلاقی حالت ابھی اس بات کی مقتضی نہیں ہی کہ وہ اپنے مخصوص
مدارس قایم کریں اور چلا سکیں، کیونکہ جس طرح یورپ میں ذاتی مکان کی تعمیر عیش پرستی میں شامل
ہی اُسی طرح ہندوستان میں اسلامی مدارس کا قیام قوم کے لیے ایک علمی تنعم اور تعیش کا
مرادف ہوگا۔

(د) جب کہ خود گورنمنٹ نے رعایا کی فلاح اور بہبود کے لیے مدارس قایم کر رکھے ہیں
تو کیا وجہ ہی کہ ہم اُن سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ لیکن یہ استدلال بظاہر کتنا ہی دل فریب اور
واقعیت پر مبنی کیوں نہو اس میں شک نہیں کہ قومی مدارس کا قیام ناگزیر ہی۔

اعتراضاتِ ماسبق کی تردید اور مدارسِ قومی کی ضرورت کا ثبوت

ہم مانتے ہیں کہ اُن کی قیام میں دقتیں ہیں اور نسبتاً کسی قدر مالی نقصان بھی
ہی لیکن جو مخصوص فوائد قومی مدارس سے حاصل ہو سکتے ہیں اُن سے قطع نظر کرنا خود تعلیم
کو غیر ضروری بلکہ مضرت رساں بنا دینا ہی۔

دُنیا میں کون ایسا بے حمیت اور ناعاقبت اندیش مسلمان ہوگا جو اپنے بچّوں کو مذہبی
تعلیم سے بے بہرہ اور تربیت اسلامی سے بیگانہ رکھنا پسند کریگا اور یہ وہ باتیں ہیں جو

بغیر اسلامی مدارس کے ممکن نہیں۔ ممکن ہی کہ اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ مسلمان طلباء کے لیے ہر شہر میں ایک "دارالاقامہ" (Boarding House) قایم کیا جائے جہاں اُن کو مذہبی تعلیم دی جائے اور تہذیب اخلاق اور تربیت اسلامی کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائے باقی رہی دنیوی تعلیم وہ سرکاری مدارس میں حاصل ہو سکتی ہی لیکن علاوہ اس کے کہ یہ صورت بھی قیام مدارس کی طرح سرمایہ طلب ہی اور بھی چند دقّتیں ہیں جن کی وجہ سے بغیر اس کے کہ ہم اپنی درسگاہیں خود قایم کریں۔ کوئی مفر نہیں کیونکہ اولًا تو یونیورسٹی کے قواعد نے ہر اسکول کے لیے ایک خاص تعداد متعین کر دی ہی جس سے زیادہ طلباء کا داخلہ ناممکن ہی علاوہ بریں اس محدود تعداد میں ہمارے مسلمان طلباً کو اپنا حصۂ رسدی ملنا محال ہی۔ سرکاری مدرسے یوں کہنے کے لیے تو بیشک گورنمنٹ کی طرف سے ہیں مگر واقعہ یہ ہی کہ اُن میں سے اکثر بالکل برادران وطن کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ حضرات مسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم رکھنا اپنا قومی فرض خیال کرتے ہیں اور ہر پیرایہ میں اورنگ زیب کے مفروضہ مظالم کا انتقام موجودہ نسل سے لینا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہی کہ مسلمان طلباء پر اوّلًا داخلہ ہی کا دروازہ اکثر بند رہتا ہی اور اگر کوئی خوش نصیب اس مرحلہ سے بھی گزر گیا تو سالانہ امتحانات کا ہفتخواں سامنے ہوتا ہی جس سے گزرنا نہایت ہی مشکل ہی۔ یہ ہیں وہ ناگزیر اسباب جنھوں نے مخصوص قومی مدارس کا قیام ایک حد تک لازمی کر دیا ہی اور جب یہ طے ہو چکا کہ اشاعت تعلیم کی اس صورت کے سوا اور کوئی سبیل نہیں ہی تو اب ہمارا یہ فرض ہوگا کہ اس راستہ میں جو دقّتیں اور موانع ہیں اُن کے رفع کرنے

کی تدبیریں سوچیں یہ مسلہ چونکہ نہایت ہی معرکتہ الآرا اور بہت کچھ دقّت نظر کا محتاج ہی لہٰذا ہم کسی قدر تفصیل سے اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

اجرائے مدارس کی دقتیں

سب سے پہلی مصیبت جو قیام مدارس کی صورت میں آئے گی وہ فراہمی سرمایہ کا سوال ہی یہ ظاہر ہے کہ چالیس سال کے متواتر تگ و دو اور شور و غل کے بعد اب بھی مسلمانوں میں بہ نسبت دوسری قوموں کے تعلیم کی نہایت افسوسناک کمی ہی اس کی تلافی بغیر اس کے ممکن نہیں ہی کہ نہایت کثرت سے اسلامی اسکول اور کالج کھولے جائیں۔

افلاس

لیکن ہمارے افلاس کا تو یہ عالم ہی کہ اس پورے صوبہ میں مسلمانوں کے صرف چھ ہائی اسکول بمشکل چل سکتے ہیں اور پورے ہندوستان میں صرف تین کالج قایم ہو سکتے ہیں جن میں سے اسلامیہ ہائی اسکول مُراد آباد، اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ کانپور اور اسلامیہ کالج پشاور گزشتہ چند سال کے پیداوار ہیں پھر یہ توقع کرنا کہ ہر بڑی قصبے میں ایک مڈل اسکول اور ضلع کے صدر میں ایک ہائی اسکول اور ہر مرکزی شہر میں ایک کالج قایم کیا جا سکتا ہی محض ایک دلخوش کن خواب سا معلوم ہوتا ہی۔

مدّتوں تک تو توسیع تعلیم کی مخالفت میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش وہیں ہوتی رہی جہاں سے اوّل اوّل ضرورت تعلیم کی صدا بلند ہوئی تھی۔

علی گڑھ جس کو نہایت صداقت اور واقعیت کے ساتھ تمام تحریکات قومی کا سرچشمہ بتلایا جاتا ہی آج سے چند سال پیشتر تک مرکزیت کے مضرت ناک خبط میں مبتلا رہا اور جہاں کہیں بھی کسی اسلامی کالج یا اسکول کے قیام کی تحریک پیدا ہوتی علی گڑھ اُس کو رقیبانہ نگاہ سے دیکھتا اور حریف بن کر میدان میں نکل آتا۔ یہ تو مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ پنجاب میں انجمن حمایت الاسلام لاہور اور اٹاوہ میں مولوی بشیرالدین صاحب باوجود مخالفتوں کے ایک ایک اسلامی درسگاہ قایم کرنے میں کامیاب ہوگئے

کالجوں کے قیام کی طرف قومی توجہ کا میلان اشاعت و نشر و تعلیم کے لئے سدّ راہ ہی

خدا کا شکر ہی کہ اب مرکزیت کا جنون باقی نہیں رہا لیکن مدّتوں کی مقرّرہ تعلیمی پالیسی میں فوری انقلاب نے رَدِّ عمل کی کیفیت پیدا کر دی ہی اور جہاں دیکھئے نئے نئے کالجوں کے قیام کے لئے اسکیمیں پیش ہو رہی ہیں اگر پہلی تفریط تھی تو اب افراط لیکن دونوں صورتیں اعتدال کے جادہ مستقیم سے الگ ہیں۔ اس لئے اندیشہ ہی کہ جس طرح پہلے پالیسی نے قومی ترقی میں بہت کچھ رکاوٹیں ڈال دی تھیں اُسی طرح یہ جوش بھی چونکہ غلط راستہ پر جا رہا ہی کچھ دنوں میں افسردہ نہ ہو جائے اور قومی بہبود کی جو کچھ اُمیدیں اب بھی باقی رہ گئیں ہیں اُن کا نوحہ بھی پڑھنا نہ پڑے۔

ہمارے خیال میں اگر ہمدردانِ قوم غور و خوض کے بعد ایک ایسی شاہراہ عمل طے کر دیں تو باوجود اِس فلاکت اور تہیدستی کے اب بھی مسلمانوں میں چندہ دینے

والوں کی کمی نہیں صرف تھوڑی سی توجہ تنظیم مصارف اور اتحاد باہمی کی ضرورت ہے۔

فراہمی سرمایہ کے طرق

مُسلمان اب بھی صدقات میں لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں ہزاروں ایسے اسلامی اوقاف ہیں جن کی آمدنی کے لئے کوئی معقول مصرف نہیں ہے علاوہ بریں چرم قربانی کی ایک معتد بہ آمدنی ہے جس سے ہر ضلع میں اعلیٰ پیمانے پر مدارس جاری ہو سکتے ہیں۔ یونہیں اگر زراعت پیشہ لوگوں میں تحریک کی جائے تو ایک کافی رقم غلہ عشر سے وصول ہو سکتی ہے جو ایک ہائی اسکول کے سالانہ مصارف سے کہیں زائد ہو گی۔ بعض اضلاع کے مسلمانوں نے اس کا تجربہ کیا ہے جو بہت کامیاب ثابت ہوا ہے میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ایک ضلع میں تو صرف چرم قربانی کی آمدنی پانچ ہزار سالانہ سے زائد ہوتی اور اس ضلع کی صرف ایک تحصیل سے پانچہزار سے زائد کا غلہ ہر فصل میں وصول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دو عربی مدرسے ایک مدرسۂ حفظ قرآن اور ایک بڑا مدرسہ جس میں عربی فارسی حساب انگریزی اور علوم دینیہ کی تعلیم کا کافی انتظام ہے۔ چار علما دو ماسٹر ایک خوش نویس اور کئی ایک ماتحت مدرسین مُلازم ہیں صرف انھیں مدات پر قایم ہیں اور قیام مدرسہ کے علاوہ چالیس پچاس طالب علموں کی غذا، لباس اور دیگر ضروریات کی کفالت بھی مدرسہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ صدقات کے مصرف میں جواز و عدم جواز کی بحث آجاتی اس لئے جب تک علما ہمارا ساتھ نہ دیں اُس وقت ان رقوم کی وصولی آسان نہیں ہے۔

علما کو ہم آہنگ بنانے کی ضرورت اور اس کی بہترین تدبیر

لیکن علما کو ہم آہنگ بنا لینا چنداں دشوار نہیں صرف ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت ہی۔ آخر تمام عربی مدارس میں منطق، فلسفہ، ریاضیات، تاریخ، ہیئت، فارسی اور خوشنویسی کی تعلیم ہوتی ہے اور عام طور پر ان کا قیام انھیں رقوم پر ہے۔ لہذا اگر ہم ایک ایسا جامع نصاب تعلیم طیار کر سکیں جن میں ایک طرف علوم دینیہ مثلاً ترجمہ قران مسائل فقہ، تاریخ اسلام اور ترجمہ احادیث نبوی کی تعلیم ہو اور دوسری طرف اُردو فارسی، خوشخطی، حساب، جغرافیہ اور آٹھویں جماعت تک کی انگریزی پڑھائی جاتی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ علما اس سے اختلاف کریں۔

فراہمی سرمایہ کے علاوہ اس نصاب کے فوائد مختلفہ

فراہمی سرمایہ کے ماسوا اس طریقۂ تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ابتدائے زمانہ میں تہذیب اخلاق اور تعلیم مذہبی کا اثر پائدار ہوگا اور آئندہ سرکاری یا مشن اسکولوں میں تعلیم پانا ان تربیت یافتہ طلبا کے لئے خطرناک نہ ہوگا۔ علاوہ بریں ابتدائے جماعتوں میں مروجہ سرکاری نصاب تعلیم کی پابندی صرف غیرضروری ہی نہیں بلکہ تضیع اوقات کی مرادف ہی۔ اُردو کا وہی گھنٹہ جس میں چوہے بلیوں کا قصہ پڑھایا جاتا ہی آسان سے ترجمۂ احادیث و سیر کی تعلیم میں صرف ہو سکتا ہی۔ نصاب انگریزی کے لئے ایسی تصنیف کرائی جا سکتی ہیں جن میں الف لیلہ کے قصوں اور پریوں کے افسانہ کے بجائے انگریزی زبان میں سلف صالحین کی تاریخی حالات اور اسلام کے

حکیمانہ نصائح ہوں اُردو سے انگریزی یا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کے لئے چھوٹی چھوٹی اخلاقی حدیثوں کا مجموعہ مرتب کرکے داخل نصاب کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سالانہ قومی مجامع میں فصیح و بلیغ خطابت کی کرشمہ سازی اور بات ہے اور قومی بہبود کے لئے خلوص اور ایثار کے ساتھ کام کرنا اور بات ہے ورنہ دنیا میں کوئی مشکل نہیں ہے جس کا حل نہ ہو اور کوئی مرض نہیں جس کی دوا نہ ہو ؎

ور بپرسی کہ دریں کار چہ تدبیر بود
دین و دنیا ہم آمیز کہ اکسیر بود

کاش ہم اپنے ہموطنوں کا طرزِ عمل دیکھکر عبرت حاصل کریں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ بنارس میں ایک مہینے کے اندر ہندوؤں نے پچاسوں شبینہ مدارس جاری کردیئے اور کچھ عرصہ میں تمام غربا اور مزدوری پیشہ لوگوں کو حرف آشنا بنا دیا ہے کیا یہ عبرت کا مقام نہیں ہے کہ وہ قوم جو برہمنوں کے سوا کسی اور کو تعلیم پانے کا مستحق نہ سمجھتی ہو اس طرح پر توسیع تعلیم کے لئے نئے نئے طرق پر عمل پیرا ہو اور مسلمان اشاعت تعلیم جن کا ایک فریضہ مذہبی ہو اس طرح غافل رہیں مسلمانوں میں جوش کی کمی نہیں۔ فیاضی اُن کا جوہر ذاتی ہے اور اخوت اُن کا خمیر۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس جوش اور فیاضی کو صحیح راستے پر لگانے والے ناپید ہیں۔ جو لوگ مدعیان رہبری ہیں اُن کی حالت دیکھکر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ ع

او خویشتن گم ست کرا رہبری کند

جس طرف دیکھئے نت نئے کالج کھولنے کی فکر ہے۔ لکھنؤ میں شیعہ کالج کے قیام کا غلغلہ برسوں سے بلند ہی۔ سلطانیہ کالج کے لئے تو شاید کسی قدر سرمایہ بھی فراہم ہو چکا ہی۔ امرتسر اور دہلی میں اسلامی کالج کھُلنے والے ہیں لیکن کیا یہ زمانہ کی ستم ظریفی نہیں ہے کہ قومی بہبود کا خیال ہمارے دماغ میں آتا بھی ہی تو غلط پیرایہ میں۔

ابتدائی مدارس کا اجرا اور ہائی اسکولوں کا قیام نئے کالج کھولنے سے زیادہ ضروری اور مفید ہی

فضائے عالم کا ذرّہ ذرّہ اس بات پر شاہد ہے کہ دُنیا میں ہر چیز کا آغاز چھوٹے پیمانہ پر ہوتا ہی اور معراج کمال کا حصول تدریجی ترقی پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں جو سوجھتی ہی اُلٹی سوجھتی ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ زینہ بزینہ صعود کے بجائے ایک ہی جست میں بام ترقی پر پہونچ جائیں تعلیمی ترقی کا خیال ہمارے دماغ میں آتا ہے تو بجائے اس کے کہ پہلے کثرت سے ابتدائی مدارس اور ہائی اسکول کھولیں ہمیں پہلے ہی دن سے کالج کے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ آخر ان کالجوں میں پڑھنے کو طلبا کہاں سے آئیں گے اور جو آئے بھی اُن پر ان کالجوں کی تربیت کا کیا اثر پڑ سکتا ہی۔ کیونکہ حقیقت میں جو زمانہ اصلاح خیالات، تہذیب اخلاق اور تربیت مذہبی کا تھا وہ میٹریکولیشن پاس کرنے تک گزر جاتا ہی ایک ہیژدہ سالہ نوجوان جس کی اُفتاد غلط پڑ چکی ہے اور بیہودہ عادتیں فطرت ثانیہ بن چکی ہیں کیونکہ کالج میں آکر سُدھر سکتا ہی؟ علاوہ بریں غریب مسلمانوں میں ایسے خوش نصیب ہیں کتنے جو بچوں کو کالجوں میں اعلیٰ تعلیم دلا سکیں؟

لہذا ہمدردانِ قوم کا پہلا فرض بحالت موجودہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنی تمام تر کوششیں کچھ دنوں کے لئے صرف ہائی اسکول ابتدائی مکاتب اور وسطی مدارس کے قیام میں صرف کریں اور ہماری تعلیمی انجمن یعنی ایجوکیشنل کانفرنس تمام خطۂ ملک میں مقامی ارکان کانفرنس اور سربرآوردگان قوم کو اس اسکیم پر عمل پیرا ہونے کی تحریک کرتی رہے کانفرنس کی جانب سے روشن خیال علما اور واعظین مقرر ہوں جن کا کام صرف اس قدر ہو کہ ہر ضلع میں جا کر دیہاتوں کے دورے کریں اور مناسب مقامات پر ابتدائی مکاتب کے قیام کے لئے لوگوں کو آمادہ کرتے رہیں اور صدر مقام میں ایک ایک اسلامیہ ہائی اسکول قایم کرنے کی تحریک کریں لیکن جب تک کہ کافی تعداد میں مدارس و مکاتب قائم نہ ہو جائیں اس وقت تک کالجوں کے خیال کو ملتوی رکھا جائے یا کم سے کم غربا اور متوسطین سے اس کے سرمایہ کے لئے اپیل نہ کیا جائے اور صرف اُمرا تک ایسی اہم تحریکوں کو محدود رکھا جائے۔

رقم صدقات کی اہمیت اور یورپ و امریکا کی مثال

بعض حضرات کا خیال ہے کہ صدقات و اوقاف کی آمدنی پر مدارس نہیں چل سکتے لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ اسلام میں تو زکواۃ انھیں اغراض کے لئے فرض کی گئی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ اب بھی مُسلمان کم و بیش اس فرض کو ادا کرتے رہتے ہیں صرف تنظیم اور توجہ کی ضرورت ہے۔ یورپ اور امریکا جیسے ممالک متمدنہ میں جہاں خود گورنمنٹ تعلیم کے لئے سب سے زیادہ توجہ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور جہاں

مذہبی طور پر کسی مخصوص حصہ آمدنی کا ان مصارف میں دنیا لازمی نہیں ہے
وہاں بھی اشاعت تعلیم کا مدار زیادہ تر صدقات اور مذہبی خیرات پر ہے۔

مشن کی مساعی تعلیمی معاملات میں

(ابتدائے کار سے ۱۹۱۰ء تک مشن نے جو تعلیمی خدمات انجام دی ہیں)

پروٹسٹنٹ

۴۷ کالجیٹ اسکول قایم کئے پانچہزار طلباء کو میٹریکولیشن پاس کرایا ۱۴۱ مذہبی مدارس اور نارمل اسکول کھولے جن میں ۷۷ ہزار چار سو طالب علم تعلیم پا چکے ہیں صنعتی مدارس میں نو ہزار طلبا تعلیم پا چکے ہیں۔ دیہاتی اسکولوں اور ابتدائے مدارس میں تین لاکھ باسٹھ ہزار طلبا نے تعلیم پائی ہے۔ مشنری کنڈر گارٹن میں ایکہزار طلبا تعلیم پا چکے ہیں۔ میزان تعداد طلبا تخمیناً چار لاکھ اٹھاون ہزار۔

رومن کیتھلک

تعداد طلبا جن کو تعلیم دیگئی۔ دو لاکھ پچیس ہزار۔

یہ تو صرف ہندوستان میں مشنری مساعی کا ایک مجمل خاکہ ہے۔ سیلون جو سیاسی طور پر ہندوستان کا جزو سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ ہے۔

اوقاف کلیسیائی اور صدقات شخصی سے جو مدارس جاری ہیں۔

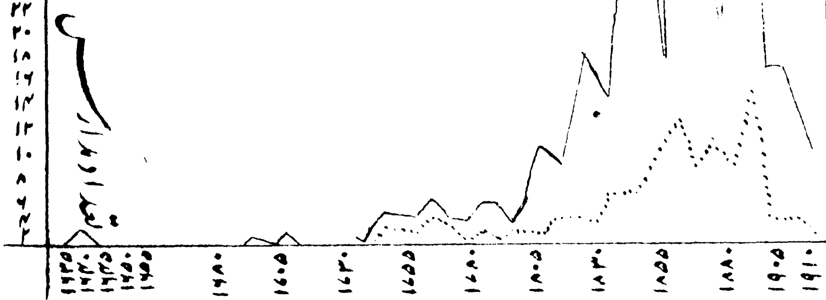
حکومت بلدی یعنی میونسپل بورڈ اور سلطنت اور قومی چندہ سے جو مدارس جاری ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ میں اعلیٰ تعلیمی مدارس کی تعداد معہ تاریخ افتتاح

(نتیجہ)

(۱) امریکا میں اُن مدارس کی تعداد اور اہمیت کہیں زیادہ ہے جو صدقات اور اوقاف زائد ہیں

(۲) اشاعت تعلیم کی پہلی کوشش صدقات اور اوقاف کے سرمایہ سے ہوئی۔ قومی چندوں اور سرکاری توجہ کا نمبر بعد کو آتا ہی



یہ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ اگر علما اور واعظین سے کام لیا جائے تو نہایت آسانی سے کچھ ہی دنوں میں ہزاروں اسلامی مکاتب کھل سکتے ہیں۔

اگرچہ اس میں شک نہیں ہر کہ علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اُٹھی تھی اور جس کو کانفرنس نے اب تک زندہ رکھنے کی کوشش کی ہی اُس کا اس قدر ضرور اثر ہوا ہے کہ عوام اہل اسلام میں انگریزی تعلیم کی طرف تعصب اور بدگمانی باقی نہیں رہی ہے تاہم

اب تک جدید تعلیمی کوشش میں شریک ہونا ثواب کا م نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اس غلط فہمی کا انسداد علما کے ہاتھ میں ہے اور اس کس مپرسی کے زمانہ میں علما کو ہم آہنگ بنا لینا چنداں دشوار نہیں۔ طوفان مخالفت کا مقابلہ سرسید علیہ الرحمۃ کر چکے اب ہمارے لئے راستہ صاف ہے۔

دعائیں دیں مری بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

(باقی آئندہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

حصۂ سوم

سائنس

یا

علومِ جدیدہ

مدیر اعزازی:

پروفیسر فیروز دین مُراد ایم ایس سی بی اے

خلاصۂ مباحث

عرضِ حال

ابتداء سازم بنامِ پاک آں بے ابتداء

مہذب ممالک میں ترقی سائنس کے لیے چار قسم کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ اولاً قوانینِ قدرت اور خواصِ اشیاء کے مطالعہ کرنے والے جن کا مقصود جدید تلاشِ حق اور تحقیقاتِ فطرت کی غرض سے معلومات کا دائرہ وسیع کرنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ زمرۂ محققین اور علم کے پیدا کرنے والوں میں شامل ہیں۔ ثانیاً وہ لوگ جو محققین کے حاصل کیے ہوئے علم کو عامۃ الناس تک پہنچاتے ہیں تاکہ سائنس جاننے والوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی رہے۔ یہ حضرات سائنس کے سکھانے والے، سائنس کے ہردلعزیز بنانے والے، پروفیسر، معلّمینِ سائنس اور علمی مضامین لکھنے والے ہیں۔ ثالثاً وہ جماعت جو قوانینِ قدرت اور خواصِ اشیاء کو محققین سے معلوم کرکے ان سے مفید مطلب کام لینے کی تجاویز سوچتی ہے اور ان کی وساطت سے متمدن دنیا کی ضروریات اور مختلف اسبابِ آسائش و آرائش تیار کرنے کی عملی تدابیر وضع کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر تحقیقاتِ سائنس کے اصولی اور نظری انکشافات سے جلبِ منفعت کرنے والی، علم کو عملی جامہ پہنانے والی جماعت۔ رابعاً جماعتِ سوم (یعنی موجدین و مخترعین) کے اشارات کے مطابق کام کرنے والے یعنی انجنیر، صناع، بڑے کارخانوں اور کلوں کے مالک وغیرہ وغیرہ۔ موخرالذکر ہر دو جماعات ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں۔

علمی دُنیا میں ایسا اکثر ہوتا ہی کہ پروفیسرانِ سائنس تعلیم و تعلّم میں مشغول رہنے کے علاوہ تحقیقات میں بھی شہرت حاصل کرتے ہیں اور انجنیر و دیگر سائنٹیفک پیشہ ور لوگ ایجاد و اختراع کی قابلیت کے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ فی زمانا یورپ امریکہ اور جاپان کے متعدد بڑے کارخانوں میں سائنس کے منتہی محض اس خدمت پر مامور ہوتے ہیں کہ سائنس کے نظری انکشافات کو ایک وسیع پیمانہ پر عملی جامہ پہنانے کے متعلق کارگر اور سودمند تجاویز تجربۃً ایجاد کریں۔ ان ماہرانِ سائنس کا فرض انجنیروں یا دستکاروں کی طرح کسی جنس کو فراواں مقدار میں تیار کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان کا کام مختلف طریقوں کا موازنہ کرنے کے بعد آسان اور باکفایت طریقوں کا انتخاب بلکہ بوقتِ ضرورت ایسے طریقوں کو ایجاد و اختراع کرنا ہوتا ہی۔ بعبارۃِ اخریٰ یہ لوگ علمِ استعمالِ علم کے ماہر ہوتے ہیں۔

کسی ملک میں فروغِ علم کے لیے ان چار طبقات کا وجود بجد و دمناسب ناگزیر ہی۔ خالص سائنس ایک منبعِ فیض ہی جس سے صنعتی تعلیم کے چشمے جاری ہوتے ہیں اس لیے عمومی طور پر یہ صحیح ہی کہ بلحاظ اولیت تحقیقاتِ سائنس ایک اساسی ضرورت ہی جس کے اوپر صنعت و حرفت کا انحصار ہی۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت غیر معمولی اور مخصوص ہی۔ ہماری سب سے اشد ضرورت صنعتی تعلیم ہی۔ وسیع پیمانہ پر علومِ جدیدہ کی اشاعت کرنا اور سائنس کے استعمال سے اعلیٰ درجہ کی تجارت اور صناعی کو فروغ دینا ہماری قومی ہستی کے لیے لابد شرائط ہیں۔ جب تک ہندوستان صنعتی اور تجارتی ترقی نہ کریگا اس کا مستقبل تاریک رہیگا۔ نہ صرف اس امر کی فوری ضرورت ہی کہ ہندوستان میں

صنعتی و تجارتی ضروریات کو خود پورا کرے بلکہ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہی کہ وہ کلیں اور مشینیں جن سے معمولی کاروبار کے لیے ضروری مشینیں بنائی جاتی ہیں خود ہندوستان میں تیار کی جائیں۔ اس مقصدِ عالی کے حصول کے لیے اُردو میں عوام الناس کو سائنٹیفک تعلیم دینے اور جگہ بہ جگہ صنعتی تعلیم کے لیے مستری خانے اور ورکشاپ کھولنے کی ازبس زیادہ ضرورت ہی لیکن یہ صرف اسی حالت میں ممکن العمل ہی جب کہ ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک ادنی سے اعلیٰ تمام جماعات سائنس سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرلیں اور سائنس ہماری روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن جائے لکچروں اور تقریروں میں سائنس کے محاسن اور عملی خدمات کے تذکروں سے اور سائنٹیفک اخبارات اور رسالجات کے اجراء سے لوگوں میں سائنس کی تعلیم کا شوق پیدا کرنا ہمارا ملکی اور قومی فرض ہی۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہونگا کہ چند مخصوص عالم جو جبلی طور پر تحقیقاتِ سائنس کے لیے موزوں ہوں ضرور انکشافات کے میدان میں قدم زن رہیں لیکن موجودہ زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے ہماری تعلیمی پالیسی یہی ہونی چاہیئے کہ سائنس کی تعلیم انجام کار متعلّمین کو اعلیٰ درجہ کے صنّاع اور دستکار بنا سکے بلکہ غرباء کی اولاد کو ابتدائی جماعتوں ہی میں کوئی نہ کوئی صنعت و دستکاری سکھانی لازم ہی۔

گلستانِ سائنس کے گوناگوں دل آویز مناظر عوام الناس کی آنکھوں سی بوجوہات چند اوجھل رہتے ہیں۔ علومِ جدیدہ کے مختص طلبہ کے ماسوائے تعلیم یافتہ جماعت کے دیگر تمام طبقے کم و بیش سائنس کی طرف عدم توجہی کے مرتکب ہیں۔ ہمارے نزدیک ابنای وطن

ہیں سائنٹیفک جمود کا حقیقی سبب مناسب علمی کتب کا قحط ہے اور توجہ کا فقدان ایک تبعی امر ہے۔ اُردو میں سائنس کی عام فہم کتب انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں اور یہ ایک متفق علیہ تاریخی واقعہ ہے کہ قومیں غیر زبانوں کے ذریعہ سے کبھی علمی ترقی نہیں کرسکتیں۔ پیشتر اس کے کہ علوم جدیدہ کی مقناطیسی کشش شغفِ علمی کے لیے محرّک ثابت ہوسکے اور سائنس سے خاطر خواہ استفادہ ممکن ہو لازمی ہے کہ ان علمی ذخائر کو قوم کی مادری زبان کا جامہ پہنایا جائے۔

اس حقیقت کے اعتراف کے بعد یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سادہ اور سلیس اُردو میں عام فہم علمی مضامین، رسائل اور کتب کی اشاعت منجملہ دیگر ملّی ضروریات کے ایک دقیع ضرورت ہے۔ ہم یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ سہولیت تفہیم کے علاوہ خوشخطی اور ارزانی تشویق مطالعہ کے لیے دو زبردست عوامل ہیں۔ خوردبینی خط، گنجانِ سطور، جھلی نما کاغذ اور ناواجب گراں قیمت کسی حالت میں علمی اشتہا پیدا نہیں کرسکتے بلکہ بسا اوقات یہی اسباب علمی ترقی کے سنگِ راہ بن جاتے ہیں۔ سفید دبیز کاغذ اور جلی خط ایک خوشنما شیرازے کے اندر مناسب ارزانی کے ساتھ علمی تحریص کے بہترین معاون ہیں۔ ہم اُمیّد کرتے ہیں کہ کانفرنس گزٹ بفضلہ تعالیٰ ان تمام خوبیوں کا مجسّمہ بن کر علم و قوم کی خدمت کرتا رہیگا۔

کانفرنس گزٹ کا اجراء اور اس کے ساتھ ایک "علمی حصّہ" کا اضافہ (جو مختلف شعبہ ہائے سائنس یعنی طبعیات، کیمیات، ارضیات، عضویات، ہیئت، ارتقاء، علم الحیات، علم آثارِ حیوانات مفقودہ وغیرہ وغیرہ علوم جدیدہ کے لیے مخصوص ہوگا) اپنی قسم کا ایک

نیا تجربہ ہی۔ علمی حصّہ کے مقاصدِ اساسی ترویج سائنس اور توسیع و ترقیِ اُردو ہیں ہمیں اس کا احساس ہی کہ کانفرنس گزٹ کا علمی حصّہ محض سائنٹیفک مضامین کے لیے مختص ہونے کی باعث اُردو رسالوں میں اپنی قسم کی سب سے پہلی مثال ہی۔ اور اس حیثیت سے اس پر غیر معمولی ذمہ داری عائد ہوتی ہی۔ لیکن اب وقت آگیا ہی کہ خالصًا سائنس کے لیے مخصوص، متعدد ماہواری رسالے اطرافِ ہند سے اُردو میں شایع ہونے چاہئیں اور پھر عزالبقا اور بقاے اصلح کے عالمگیر نوامیسِ فطرت کے ماتحت ان میں سے بہترین علم و قوم کی خدمت کے لیے منتخب ہو جانے چاہئیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہی کانفرنس گزٹ کے ساتھ حصّہ سائنس کا اجراء ایک نئی قسم کا تجربہ ہی اگر ہمارا تجربہ ناکام رہا اور نامساعد حالات اور غیر متوقع مشکلات کی پیدا ہو جانے سے یہ حصّہ قبل از وقت بند ہو گیا تو یہ کوئی قومی مصیبت یا نادر واقعہ نہو گا۔ باغِ عالم میں ہزاروں پھول بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ ایک سمجھدار مالی کا فرض ہوتا ہی کہ ننھے نازک پودوں کو مناسب احتیاط کے ساتھ رکھے اور گزشتہ کے تلخ تجربہ سے آیندہ کے لیے قوی تر اسبابِ حفاظت بہم پہنچائے اسی طرح اگر یہ تجربہ خدانخواستہ ناکام رہا تو مایوس ہونے کی بجائے ناکامی کے اسباب کا ازالہ کرنے، حصولِ مراد کے لیے بہتر تجاویز سوچنے، ان پر عمل پیرا ہونے اور جملہ موانع کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن معقولیت کا اقتضا یہی ہی کہ جب تک قوم اس سے بہتر تجربہ کی استطاعت نہ رکھتی ہو علم دوست اصحاب اس کی معاونت کو اپنا فرضِ منصبی خیال کریں۔ ہم اپنی طرف سے اس حصہ کو

کامل توجہ اور پوری کوشش کے ساتھ روز بروز بہتر بنانے کی فکر میں رہینگے اور اگر مالک کو منظور ہوا تو نہ صرف یہ حصّہ سائنس جاری رہیگا بلکہ ترقی کرتے ہوئے ایک مستقل جداگانہ علمی رسالہ بن جائیگا۔ اَلسَّعیُ مِنَّا وَالْاِتمَامُ مِنَ اللہِ۔ آیندہ اشاعتوں میں انشاءاللہ القوی ہم منتخب علمی (سائنٹیفک) خبریں مشاہیر سائنس (زمانہ حال و ماضی) کی سوانح عمریاں جدید علمی قیاسات، سائنس کی عملی خدمات صنعتی اکتشافات۔ سائنس اور اسلام۔ خانگی امور زراعت، اور مشہور دستکاریوں میں سائنس کی مدد سے فائدہ حاصل کرنے اور اسی قسم کے دیگر ضروری مباحث کے متعلق مفید دلچسپ علمی مضامین شایع کرتے رہینگے۔ تمام بزرگان قوم سے جو اس بارہ میں ہمارا ہاتھ بٹا سکیں ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے سائنٹیفک نتیجات قلم سے کانفرنس گزٹ کے حصّہ سائنس کی رونق دوبالا کریں۔

ہم ایک سادہ اُصول ناظرین کرام کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ "علمی اصطلاحات حتی الامکان غیر مانوس پیچیدہ اور ادق وضع نہیں کرنی چاہئیں"۔ اس اُصول کی مطابق ہمیں ایسے بسیط انگریزی الفاظ کو جو بوجہ کثرت استعمال اُردو میں مشہور و معروف ہوگئے ہوں یا جن کی مرادف اصطلاحات ثقیل اور غیر مانوس عربی فارسی الفاظ کے بغیر اور کوئی نہ ملتی ہوں اپنی علمی زبان کا جزو بنا لینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عام طور پر کسی زندہ زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کا بجنسہ استعمال کرنا واقعی قبیح امر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی شہرت عامّہ، تلفظ کی سہولیت اور ہم مرادف اصطلاحات کی مساوی یا بڑھی ہوئی غیر مانوسیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ علوم جدیدہ کو یوپی

زبانوں سے اُردو میں نقل کرتے ہوئے ہمیں ترجمہ کی بجائے نفسِ مطلب کو صاف اور واضح انداز سے ادا کرنے کی جانب زیادہ متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ کسی نئی چیز کی ولج پذیری کے لیے اوّلین شرط اس کی صحیح تفہیم ہے۔ اور دوسرے درجہ پر مختصر سادہ نام ہے۔ ڈاروِن سے قبل انواع حیوانات کی ابتدا اور آغاز کے متعلق متعدد محققین مبسوط تصانیف لکھ چکے تھے لیکن جو مقبولیت فلسفۂ ارتقاء کو ڈاروِن کی بے نظیر کتاب "آغاز انواع" کی اشاعت کے بعد حاصل ہوئی پہلے کبھی نہوئی تھی۔ اس کے وجوہات وہی ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ اوّل حسنِ ادا دوئم تمام مسئلہ کے لیے ایک مختصر لیکن پر معنے نام۔ انتخاب فطری۔ کا وضع کرنا۔

مشرحہ صدر اصول کے مطابق ہم ان صفحات میں الفاظ "سائنس" (بمعنی علم و علوم جدیدہ) "سائنٹیفک" (بمعنی متعلق بہ سائنس علمی یا علوم جدیدہ سے منسوب) وغیرہ کسی قسم کی مزید تشریح کے بغیر بکثرت استعمال کرینگے اور جہاں کہیں لفظ علم یا علمی مستعمل ہوگا وہاں بالعموم اس سے مراد سائنس یا سائنٹیفک ہوگا بشرطیکہ متن اس مفہوم کے منافی نہو۔

مضمون نگار اصحاب سے التماس ہے کہ وہ لفاظی کی بجائے واقعات اور حقایق کی تشریح پر زیادہ توجہ صرف کریں۔ ہر ایک مضمون کا ایک خاص مقصد ہونا چاہیئے اور اپنی طرف سے کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ اس کے مطالعہ سے ناظرینِ رسالہ کے کسی نہ کسی طبقہ کے علم میں ضرور اضافہ ہو۔ اپنی علمی بے بضاعتی یا ذہن کے کند ہونے کے

باعث ہم اس امر کے قائل نہیں ہیں کہ سائنٹفک مضامین لازمی طور پر اردوئے معلیٰ ہی میں لکھے جائیں لیکن اگر تشریح مطالب کے ساتھ زبان بھی شستہ و سلیس ہو تو اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ سونے پر سہاگے کا کام دیگی۔

اکثر سائنس داں حضرات جن کے دماغ علم کے خزانے ہوتے ہیں اردو میں قلم اٹھاتے ہوئے محض اس لیے جھجکتے ہیں کہ وہ شاندار الفاظ، دقیق اصطلاحات اور متین محاورات کے نہ ملنے کے باعث عبارت آرائی سے قاصر ہوتے ہیں۔ ہم بطیب خاطر اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ کانفرنس گزٹ کے حصۂ سائنس کے صفحات ہر قسم کے سائنٹفک مضامین کے لیے وقف ہیں خواہ ان کی عبارت بھونڈی ہو یا مرصع۔ بامحاورہ ہو یا سادہ بشرطیکہ ان کے مطالعہ سے معلوماتِ عامہ میں اضافہ ہونے کی توقع ہو سکے اور علمی مسائل وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہوں۔

کوئی اخبار یا رسالہ خریداروں کی ایک معقول تعداد کے بغیر فروغ نہیں پا سکتا۔ لیکن خریداروں کی کثرت زیادہ تر مضامین کی عمدگی اور اخبار کی باقاعدگی پر مستلزم ہے۔ خریداروں کی تعداد کو کم کرنے والی ایک خاص جماعت ہے جسے حال ہی میں "نمونہ باز" کے موزوں نام سے ملقب کیا گیا ہے۔ ہم کسی سے یہ نہیں کہتے کہ وہ اس رسالہ کو خواہ مخواہ اچھا یا مفید خیال کرے لیکن ہم اس امر پر ضرور اصرار کرینگے کہ اگر کوئی صاحب کانفرنس گزٹ اور اس کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہوں تو وہ "نمونہ بازوں" کے زمرہ میں شمولیت سے احتراز کریں اور براہِ راست خریدار بن کر اس کا مطالعہ کریں۔ مشقِ دوم مضامین

کی عمدگی اور رسالہ کی باقاعدگی کے متعلق ہمیں یہ عرض کرنا ہی کہ جہاں تک ایک آنریری اڈیٹران امور کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہی وہاں تک ہم بعونہ تعالیٰ محنت یا کوشش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرینگے لیکن زیادہ تر یہ امور دفتر کانفرنس سے متعلق ہیں اور اشاعت کی باقاعدگی کا انحصار تماماً دفتر پر ہی۔ اس کا حصول صرف اس انداز سے ہوسکتا ہی کہ کانفرنس گزٹ کو ثانوی اہمیت کا ایک ضمنی کام سمجھنے کی بجائے لسے مقاصدِ کانفرنس کے حصول کا ایک زبردست آلہ تسلیم کرکے دفتر کے فرائض مہمہ کی صفِ اوّل میں شمار کیا جائے۔ اگر کانفرنس گزٹ کی طرف مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی جیسا جیّد عالم کافی توجہ مبذول فرمائے اور کانفرنس کا وسیع دفتر اس سے غافل نہ ہو تو انشاء اللہ القوی کانفرنس گزٹ بہت جلدی ملک کے ممتاز جرائد میں شمار کیا جاسکیگا۔

مضامین کی عمدگی کے تین ذرایع ہیں۔ (۱) تمام مطبوعہ مضامین کے لیے کم از کم ایک روپیہ فی صفحہ قلمی زرِمعاوضہ ادا کیا جانا چاہیئے۔ خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ مضامین کے لیے دو تین روپئے فی صفحہ کچھ زیادہ معاوضہ نہیں ہی۔ (۲) لیکن چونکہ ابھی ہمارے ملک میں قلمی زرِمعاوضہ دیگر مہذب ممالک کی طرح وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ نیز چونکہ ہم سرِدست مسلّم الثبوت ماہرینِ فن کے مضامین کے لیے معقول زرِمعاوضہ (بحساب پندرہ بیس روپئے فی مطبوعہ صفحہ) ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اس لیے جناب سکرٹری صاحبان کانفرنس سے میری استدعا ہی کہ وہ کانفرنس گزٹ کے علمی

حصہ کے لیے اعلیٰ قسم کے مضامین مُفت حاصل کرنے اور ہندوستان کے بلند پایہ سائنس دانوں اور عالموں کی توجہ منعطف کرانے میں میری مدد فرمائیں۔ (۳) جب اخبارات اور رسالے عرصہ دراز تک عزت کی زندگی بسر کرتے یا خریداروں کی کثرت سے مشہور و ممتاز ہو جاتے ہیں تو اُن کو مضمون بھیجنا عزّت افزائی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور مستند عالم خواہش سے ان میں اپنے مضامین شایع کراتے ہیں لیکن یہ اعلیٰ مرتبہ ہندوستان میں بہت کم اخبارات کو حاصل ہے اور کانفرنس گزٹ تو آیندہ چند سال تک اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی +

فیروز دین مراد

مُعمّۂ کائنات

یہ مضمون شہرۂ آفاق جرمن پروفیسر ارنسٹ ہیکل کی شاندار جرمن تصنیف ڈی ویلٹ ریٹسل کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا ماخذ جوزف مک کیب کا انگریزی ترجمہ رڈل آف دی یونیورس ہے۔ اگر یہ ترجمہ مقبول ہوا تو انشاءاللہ تمام کتاب بالاقساط شایع کر دی جائیگی۔ اصل کتاب کی عالمگیر مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بیس سال سے کم عرصہ میں تخمیناً چودہ لاکھ جلدیں ایک درجن سے زائد زبانوں میں ہاتھوں ہاتھ بک چکی ہیں۔ محض انگریزی زبان میں دو لاکھ جلدیں فروخت

ہو چکی ہیں اور فی الحقیقت یہ کتاب کیا بلحاظ سلاستِ زبان وحسنِ ادا، اور کیا بلحاظ وسعتِ مضامین و معقول پسند بیباکانہ اظہارِ عقائد، دنیا کی معدودے چند واقعی اچھی کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ ایسی بے مثل کتاب کے اردو ترجمہ کی عدمِ مقبولیت کی صرف دو وجوہات قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اول ترجمہ کی خرابی دوئم ملک کے اردو خواں طبقہ میں صحیح علمی مذاق کا کامل یا ادھورا فقدان۔

گو میں ہیکل سے تماماً متفق نہیں ہوں اور اکثر مقامات پر اس سے مخالف رائے رکھتا ہوں (جیسا کہ حواشی سے ظاہر ہو جائیگا) لیکن ایسا اختلاف غیر محدود تحسین کو دبا نہیں سکتا)

اربابِ بصیرت کے لیئے انیسویں صدی عیسوی کا اختتام ایک روح فرسا منظر پیش کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ اصحاب کا اس بارہ میں اتفاق رائے ہے کہ کئی ایک لحاظ سے یہ صدی سابقہ صدیوں سے بلا حد و حساب سبقت لے گئی ہے اور بہت سے کام جو اس کے آغاز پر ناممکن العمل تصور کیئے جاتے تھے، دوران صدی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں۔ نہ صرف صحیفۂ فطرت کی وسیع نظری مطالعہ، قوانینِ قدرت کے انکشاف، اور قوائے فطرت کے بیش از بیش استفادہ سے بلکہ علومِ جدیدہ کے شاندار اور پراز منفعت عملی استعمال سے ہماری تہذیب جدید کے ہر ایک شعبہ میں ایک نئی روح پھونکی گئی ہے۔ بخلاف اس کے ہم نے اخلاقی اور عمرانی زندگی میں بمقابلہ سابقہ صدیوں کے بہت

قلیل ترقی کی ہی بلکہ بعض اوقات اس میں رجعت قہقری شروع ہو گئی ہی (یعنی زمانۂ حال میں اخلاقیات اور عمرانیات میں انسان نے ترقی کرنے کی بجائے تنزل کیا ہی اور باوجود مادّی تہذیب میں ترقی کرنے کے ان سے ایک گونہ نفرت پیدا ہو گئی ہی) اس بیّن تناقض سے نہ صرف تفریق و تکذیب کی ایک ناتسلی بخش مخدوش ذہنی حالت پیدا ہو گئی ہی۔ بلکہ سیاسی اور عمرانی دنیا میں خطرناک انقلابات کا خدشہ لاحق ہو گیا ہی۔ (ہیکل کی یہ کتاب جس کا پورا نام "انیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر معمّۂ کائنات" ہی ۱۸۹۹ء میں لکھی گئی تھی موجودہ جنگ فرنگ پر غور کرتے ہوئے ہیکل کے یہ الفاظ ملہم معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیکل الہام والقاء کا قائل نہیں ہی۔ اس لیے اس کے متعلّق ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے آج سے اٹّھارہ سال قبل یورپ کی بین الاقوامی نظر فریب لیکن مخدوش حالت اور مادّیت کی طرف غیر معمولی رجحان طبایع کا بہ نظر امعان اسی صحت کے ساتھ مطالعہ کر رکھا تھا کہ آج اس کا یہ پیش بین قیاس بعینہٖ صحیح ثابت ہو رہا ہی) اس لیے ہر ایک صحیح الدماغ مبصّر اور خیرخواہ بنی نوع انسان کو نہ صرف یہ حق حاصل ہی بلکہ اس کا پاک فرض ہی کہ وہ اس تناقض کو (یعنی مادّیت اور اخلاقیات کے مابین وہ سطحی تخالف جو مادّیت سے الفت اور اخلاقیات سے نفرت اور ترقی معکوسہ کا نتیجہ ہی) کی سلجھانے اور اس کے مابعد آنے والے خطرات کی مدافعت کرنے کے لیے بدل و جاں کمربستہ ہو جائے۔ ہمارا اعتقاد ہی کہ یہ مقصد عالی صرف تلاش حق کی جوانمردانہ کوشش اور کائنات کے متعلق ایک ایسے صاف اور صریح عقیدہ کے رکھنے سے حاصل ہو سکتا ہی جو صرف حق کے اوپر مبنی ہو اور واقعیت کے عین مطابق ہو۔"

اگر ہم اُنیسویں صدی کے شروع میں سائنس کی ردی حالت کا مقابلہ اس کے آخری سالوں میں علم (سائنس) کی پُر شوکت ترقی سے کریں تو ہم اس حقانیت کے اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اثنائے صدی میں حیرت انگیز اور شاندار علمی (سائنٹیفک) ترقی انجام پذیر ہوئی ہے۔ علم کا ہر ایک شعبہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ اس صدی میں بالعموم اور اس کے آخری نصف حصہ میں بالخصوص انسانی علم میں نہایت ہی قابلِ قدر معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ اشیاء صغیر کے خوردبینی مطالعہ اور اجرام فلکی کی دُوربینی تحقیقات سے ہمیں ایسی قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو کہ آج سے سو برس قبل انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ صحیح اور اصلاح شدہ خوردبینی و حیاتی طریقہائے تحقیقات سے ہم نے نہ صرف عالمِ جراثیم میں جاندار کی ایک نئی غیر مرئی دُنیا دریافت کر لی ہے بلکہ ان کی وساطت سے ہم نے بسیط خلیہ (شبکہ یا سیل) کے متعلق وسیع معلومات حاصل کر کے اب یہ بات سمجھ لی ہے کہ سب سے ابتدائی اور سادہ ساخت کی اوّلین جاندار ہستی یہی ننھا خلیہ ہے جس کے نظامِ اجتماعی سے ہر ایک پودے اور حیوان حتےٰ کہ انسان کے رگ و ریشے بنے ہوئے ہیں۔ یہ تشریحی علم (تشریح الابدان کے متعلق معلومات) ازبس ضروری ہے اور اس کی تکمیل اس جنینی انکشاف سے ہوتی ہے کہ ایک ہر ایک جاندار ننھی چیونٹی سے لیکر عظیم الشان ہاتھی تک ابتدائً صرف ایک واحد خلیہ یعنی حاملہ انڈے سے (بذریعہ نمو و تغذیہ) ترقی کرتا ہے۔ نظریۂ خلیہ جو اس انکشاف پر مبنی ہے ان طبعی، کیمیائی اور نفسیاتی اعمالِ حیات کی صحیح تعبیر کرتا ہے جن کی تفہیم کے لیے قبل ازیں ایک ما فوق الفطرت طاقت یا غیر فانی رُوح کو تسلیم کرنے کا رواج تھا۔ مزید برآں اب مرض کی اصلی حقیقت منکشف

ہو گئی ہے اور اطباء سہولت کے ساتھ خلیی علم الامراض کی وساطت سے مختلف بیماریوں کو کماحقہ سمجھ سکتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے انکشافات علوم طبعی بھی کچھ کم معرکۃ الآرا نہیں ہیں۔ طبیعات نے اپنی وسیع حدود کے اندر ہر ایک شعبہ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ علم النور اور علم الصوت علم المقناطیس اور علم البرق، علم الحرارت اور علم القوت سابق سے کئی گنے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ لیکن سب سے ضروری اور اہم یہ امر ہے کہ طبیعات نے تمام عالم کے قویٰ کی یگانگت ثابت کر دی ہے یعنی کہ گرمی، روشنی، آواز، بجلی، مقناطیس، کششِ کیمیائی وغیرہ مختلف ہستیاں قوت کے مختلف مظاہر ہیں اور اس لحاظ سے متحد النوع ہیں۔ یہ تمام قوائے فطرت اس لحاظ سے ایک ہی خاندان کے مختلف افراد اور باہمدگر متعلق ہیں۔ بجلی حرارت میں تبدیل ہو سکتی ہے اور حرارت کے صرفہ سے برقی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کیمیائی کشش سے برقی رَو اور برقی رَو سے روشنی، آواز مقناطیس وغیرہ مظاہر قوت حاصل کیے جا سکتے ہیں) حرارت کی نظریۂ میکانیکی نے ثابت کر دیا ہے کہ قوت کی مختلف اقسام کس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور کس طرح ایک قسم کی قوت دوسری قسم کی قوت میں مبتدل ہو سکتی ہے۔ انحلالِ نور کے مبسوط مطالعہ سے حضرت انسان زمین سے اُڑ کر آسمان کی خبریں حاصل کر لائے ہیں اور اب ہم وثوق کے ساتھ یہ امر ماننے کے لیے تیار ہیں کہ وہی اقسام مادّہ (وہی عناصر جن سے زمین پر جملہ اجسام، حتیٰ کہ حیوانات اور انسان بنے ہوئے ہیں، سورج، چاند، سیاروں بلکہ بعید ترین ستاروں کے اجزاء ترکیبی میں شامل

ہیں ا۔ ایک جدید شعبہ علم ہیئتِ طبیعاتی نے ہمارے مطمح نظر کو بے اندازہ وسعت بخشدی ہی۔ اس کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہوا ہی کہ فضاء بسیط کے اندر ہم سے اور بہا میل دُور زمین اور سورج سے بڑے بڑے بے شمار کرہ موجود ہیں جو زمین کی طرح ہر وقت سرگردان حیات و ممات کے لامتناہی چکّروں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نت نئی دنیائیں کتم عدم سے معرضِ شہود میں آ رہی ہیں اور طلوع و غروبِ عالم کا سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے گوناگوں جلوے دکھاتا ہی۔ بقول شاہ ظفر مرحوم ع

روز معمورۂ دُنیا میں خرابی ہی ظفر)

علمِ کیمیا نے ہمیں بہت سی نئی چیزوں سے شناسا کردیا ہی اور طرفہ یہ ہی کہ وہ سب کی سب باوجود اپنی حیرت انگیز گوناگونی کے صرف معدودے چند عناصر (بسیط اقسام مادہ جن کی تاحال مزید تحلیل نہیں ہوسکی) سے مرکب ہیں۔ اِن میں سے بعض عناصر زندگی کے ہر ایک شعبہ میں نمایاں حصّہ لیتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے ایک عنصر کاربن (بسیط زغال) کی بابت یہ امر بالتحقیق ثابت ہوگیا ہی کہ یہ جملہ مرکبّاتِ حیوانی اور نباتی (جنھیں مرکبات الیتہ الاصل بھی کہتے ہیں) کا جزو لاینفک ہی اور اسی لحاظ سے بعض عالمانِ سائنس اس کو زندگی کا کیمیائی اصل خیال کرتے ہیں۔ لیکن طبیعات اور کیمیات کی تمام ترقی نظری لحاظ سے اس عظیم الشان قانون (قانونِ عدم فناء مادہ و قوت) کے سامنے ہیچ ہی۔ چونکہ یہ اساسی عالمگیر قانون مادہ اور قوت کی دائمی اور ازلی بقاء ثابت کرتا ہی (بالفاظِ دیگر یہ امر ثابت کرتا ہی کہ انسان اپنے انسانی ذرایع کی تحقیقات کے بل بوتے

پر نہ تو مادہ کا ایک ذرہ فنا کرسکتا ہے اور نہ اسے بنا سکتا ہے۔ اور اسی طرح نہ تو قوت نیست سے ہست میں پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ انسان قوت کی قلیل ترین مقدار فنا کرنے پر قادر ہے۔ انسان صرف ان دونوں ہستیوں کی تبدیلیوں اور اُن کے اختلافات پر قادر ہے یعنی موجودہ قوت یا مادہ کی ایک قسم کو دوسری اقسام میں بدل سکتا ہے) اس لیے ہمارے فلسفۂ وحدانیت میں یہ قانون معمۂ کائنات کے حل کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔

چونکہ ہم آیندہ ابواب میں دورانِ صدی کے اندر مطالعۂ فطرت کے متعلق اپنے علم کی واقعی حالت اور ترقی کا بالتفصیل تذکرہ کرینگے اس لیے ہم یہاں سائنس کے مختلف شعبوں پر مزید تبصرہ لکھنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرینگے۔ ہم یہاں صرف اس مہتم بالشان انکشاف کی طرف اشارہ کرینگے جو متذکرہ صدر قانونِ مادہ و قوت کی ہمعصری کے علاوہ اس کی تکمیل کرتا ہے۔ ہماری مراد نظریۂ ارتقائی کے استحکام سے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج سے ایک ہزار برس پہلے ہی بعض حکما (فلسفی) چیزوں کے ارتقاء کا ذکر کرتے تھے لیکن اس امر کی تشریح کہ اس قسم کا کوئی قانون تمام کائنات پر حاوی ہے اور دنیا "مادہ اور قوت" کے غیر متناہی ارتقاء کے سوائے اور کچھ نہیں صرف انیسویں صدی کا مایۂ افتخار ہے۔ بلکہ حق الامر یہ ہے کہ اس قانون کی مکمل تحقیقات گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں میں ہوئی ہے اور جبھی سے اس کی عالمگیر وسعت تسلیم کی گئی ہے۔ اس اصول کو نظری بنیادوں پر قایم کرنے اور اس کی عالمگیر وسعت منوانے کی لازوال شہرت، مشہورِ نام

محقق چارلس ڈارون کا حصہ ہے۔ ڈارون نے قانونِ ارتقاء کو ۱۸۵۹ء میں اپنی بینظیر کتاب موسومہ "آغازِ انواع" کی اشاعت اور نظریۂ انتخابِ طبعی کے بالتفصیل ثابت کرنے سے مکمل کیا۔ ۱۸۰۹ء میں فرانس کے قابل محقق لیمرک نے اجمالی طور پر اس قسم کے خیالات ظاہر کیے تھے اور اس سے بھی پہلے ۱۷۹۹ء میں جرمنی کے سب سے بڑے شاعر اور عالم ولف گانگ گیٹے نے حیرت انگیز پیش بینی کے ساتھ اسی قانون کے بنیادی اور مرکزی خیال کی توضیح کی تھی۔ یہ قانون دُنیا جہاں کے تمام سوالات میں سے اہم ترین سوال "نظامِ عالم میں انسان کے رتبہ" اور اس کی طبعی ترقی پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگر ہم فی زمانہ ملکتِ سائنس میں قانونِ ارتقاء کے نفوذ کو تسلیم کرتے ہیں اور قانونِ مادہ و قوت کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے سے تمام مظاہرِ فطری کی بسیط اور معقول تشریح کر سکتے ہیں تو ہم زیادہ تر انہیں تین شہرۂ آفاق عالمانِ صحیفۂ فطرت کے رہینِ منت ہیں:- یہ تینوں محقق (ڈارون۔ لیمرک، اور گیٹے) اُنیسویں صدی کے تمام بڑے آدمیوں میں اوّل درجہ کے ستاروں کی مثل ممتاز ہیں۔

مہذب زندگی کے ہر ایک شعبہ میں سائنس کی علمی خدمات مظاہرِ قدرت کی نظری مطالعہ کی اس حیرت انگیز ترقی کے دوش بدوش رہی ہیں۔ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی تجارت بُعد و وقت پر ٹیلیفون اور تار برقی کے ذریعہ سے کامل فتح کا حصول اور دیگر مفید علمی نتائج اور سہولتیں زیادہ تر علوم طبیعیات کی صنعتی ترقی سے بالعموم اور برق و بھاپ کے استعمال سے بالخصوص حاصل ہوئی ہیں۔ اگر ہم نے تصویر کشی میں وہ کمال حاصل کر لیا ہے کہ

سبز موتفاوت کے بغیر ہم سورج کی شعاعوں کے ذریعے سے ہر ایک چیز کی تصویر ہو بہو اُتار سکتے ہیں، اگر ہم نے زراعت اور دیگر فنوں میں معتد بہ ترقی کر لی ہے، اگر ہم نی جراحی میں خواب آور ادویہ اور عارضی طور پر رنج و راحت سے بے خبر کر دینے والی اشیاء مثلاً کلورافارم کے استعمال سے بنی نوع انسان کو ناقابلِ برداشت تکالیف کے آہنی پنجہ سے آزاد کر لیا ہے تو یہ سب صنعتِ کیمیا کے ثمراتِ اوّلیں ہیں۔ لیکن یہ سائنس کی گوناگوں عملی خدمات جن کی بدولت ہم گزشتہ صدی میں سابقہ صدیوں سے بے اندازہ سبقت حاصل کر گئے ہیں اسقدر معروف ہیں کہ ہمیں ان کے متعلق کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (باقی آئندہ)

فیروزدین مراد

گھر کی مکھی انسان کی قاتل

(۱)

[سال گذشتہ میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے سامنے ایک مضمون بعنوان گھر کی مکھی پڑھا گیا تھا اور اس میں سائنٹیفک سوسائٹی سے استدعا کی گئی تھی کہ کالج کے ڈائننگ ہال کو منحوس نجس و ناپاک مہلک، مار آستین مکھیوں سے نجات دلوائی جائے۔ اس کے جواب میں میں نے بحیثیت صدر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "اولاً" سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے ایک عام فہم رسالہ مکھی کے متعلق شائع ہو کر طلبہ اور عوام الناس میں تقسیم ہونا چاہیئے اور دیم طلبہ کو مستعدی کے ساتھ مکھیوں کے خلاف نبرد آزما ہونا چاہیئے۔ جہاں کہیں مکھیوں کو خوردنی اشیاء پر بیٹھا ہوا دیکھیں وہاں سے پرہیز کریں۔ بازار میں صرف ان دکانداروں کے ہاں سے سودا خریدیں جو اپنی اشیاء کو ڈھانپ کر رکھیں۔ اپنے گھروں میں اصرار کے ساتھ مکھیوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کریں اور اگر ڈائننگ ہال اور باورچی خانہ میں مکھیوں کے انسداد کے لئے تمام دروازوں کھڑکیوں اور روشندانوں پر جالی کے پردے نہ لگا دیئے جائیں یا دیگر مناسب تدابیر مکھیوں کی اخراج کے متعلق نافذ نہ کر دی جائیں تو معقولیت کے ساتھ حکام ذمہ دار کو باقاعدہ اطلاع دہی کے بعد ڈائننگ ہال سے کھانا کھانا ترک کر دیں"

اس کے بعد سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ نے دسمبر گذشتہ میں مفید علمی کتب کے بہترین اردو تراجم اور تعطیلات گرما میں قابل تعریف علمی (سائنٹیفک) کاموں کے لئے سنہرے تمغوں اور نقد انعام (۱۰۰) کا اعلان کیا تھا محمدن کالج علی گڑھ کے ایک ہونہار طالب علم محمد اسد اللہ صاحب حیدر آبادی نے محنت اور جانفشانی سے بعنوان بالا تین جزو کا ایک عام فہم رسالہ مرتب کیا ہے جس کے ابتدائی صفحات ہم یہاں بغرض اطلاع عام اور حصول آراء درج کرتے ہیں۔ مراد]

تمہید

امراض متعدی کے اسباب اور زمانہ گزشتہ و موجودہ میں انسانوں کی غفلت۔ توارث کا اثر۔ جراثیم اور ان کا منتقل ہونا۔ مکھی انسان کی قاتل ہے

امراض متعدی کے اسباب اور زمانہ گزشتہ و موجودہ میں انسانوں کی غفلت

ماہرین فن طبابت نے امراض اور ان سے بے وقت کی اموات کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ امراض جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ انسانوں کے درپے آزار اور موقع کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ جس طرح امراض مختلف اسی طرح جراثیم بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کا شمار حد امکان سے باہر ہے۔ آفت تو یہ ہے کہ دشمن پاس ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے سیکڑوں اور ہزاروں سال سے انسانوں اور حیوانوں پر خوب دل کھول کر زیادتیاں کیں۔ مریض راضی برضا جو گزرتی سہ لیتے تھے۔ علاج کرنے پر بھی شفا عنقا کی مثال تھی کیونکہ مرض کی تشخیص ہی نہ تو دوا سے فائدہ ہونا معلوم۔ اس پر روتے جھینکتے صحت ہوئی تو ادھوری اور عارضی کیونکہ چور تو کمین گاہ میں چھپا رہتا تھا یہ صرف نشانہ کو ٹھیک ٹھاک کرتے تھے۔ مگر یہ سب باتیں اب تقویم پارینہ ہوگئیں ہیں۔ زمانہ نے اپنا قالب بدلا۔ اب اکثر امراض کے اسباب و علل اطبا کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ کوئی نیا مرض ظاہر ہوا تو لگے ہاتوں اس کے سبب اصلی کی ٹوہ شروع ہوجاتی ہے اور دفعیہ کی بہتر سے بہتر تدبیر کا کھوج لگا لیتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے

ہیں کہ علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ کوششیں بھی بار آور ہو رہی ہیں۔

دنیا میں ہر مرض کا علاج ہے مگر لاپروائی کی دوا لقمان کے دواخانے میں بھی نہیں۔ انسان خود اپنا آپ تھوڑا بہت بھی خیال نہ کرے تو حیف ہے خود جن کی جان معرضِ خطر میں ہو وہ تو کانوں میں انگلیاں دھر کر لگے رہیں عیش و عشرت کے مزے لوٹنے میں تو پھر ایسی کسی کو کیا پڑی ہے کہ خواہی نخواہی ان کے سر ہو اور کان پر ڈھول بجا بجا کر کہتا پھرے کہ دیکھو دشمن دروازے پر ہے اٹھو گے بھی یا یوں ہی متاع زندگی کو عیش و عشرت کی نذر کردگے۔

توارث کا اثر یہ خود اوندھے منہ گڑھے میں گرے تو گرے غضب تو ہے کہ ماں باپ کی بد اعمالیاں تین تین چار چار پشت تک اولاد کے سر ہوتی ہیں۔ اسلاف کی جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا اولاد کو ورثہ میں آنا ایک مسلمہ امر ہے۔ مانا کہ بچہ ماں کے پیٹ سے مرض میں مبتلا ہو کر نہ نکلے مگر یہ ضرور ہے کہ مرض کے قبول کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ضرور ساتھ لیتا آتا ہے۔ اسی بنا پر ایک بڑی ذمہ داری اور اہم فریضہ ماں باپ پر عاید ہوتا ہے جس طرح کسان اپنی زمین کو مختلف تدبیر سے زرخیز بنا دیتا ہے اسی طرح انسان بھی چاہے تو اپنی نسل اور قوم کی فلاح اور بہبود میں بہت کچھ ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ جو انسان صرف خواہشات نفسانی اور جذبات حیوانی کی تکمیل کے پیچھے پڑا رہے اس کو انسان کہنا حقیقتہ میں انسانوں کو بدنام کرنا ہے۔ کیونکہ اس کی ہر حرکت صراط مستقیم سے ہٹی ہوئی اور خود اس کے اور بنی نوع انسان کے حق میں مضر ثابت ہوگی۔ حق تو یہ ہے کہ انسان کو انسان بننا آسان نہیں۔ خود اپنے نفس کے حقوق۔ اپنے اہل و عیال کے حقوق۔ اپنی قوم اور ملک کے حقوق کی حفاظت و

نگہداشت ایسی ذمہ داریاں ہیں کہ اچھّے اچھّوں کو لغزش ہو جاتی ہے۔

جراثیم اوران کا منتقل ہونا غرض امراض کا سبب جراثیم ہوتے ہیں۔ مگر ایک قسم کے جراثیم مختلف امراض پیدا نہیں کر سکتے۔ اور نہ یہ خود بخود نقل و حرکت کرکے ہمارے جسم میں سرایت کر سکتے ہیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ کام کاج میں یہ ہمارے ہاتوں سے لگ لپٹ کر چلے آتے ہیں اور کھانے پینے کے وقت ہمارے منہ تک ان کی رسائی ہوتی ہے۔ پھر سانس اور غذا کے ذریعے شش اور معدے میں ان کا عمل دخل ہوتا ہے۔ دانتوں کے میل اور کثافت میں ان کی نشوونما کو اس قدر سہولت ہوتی ہے کہ ایک سے ہزار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر وقت اور خصوصاً رات میں دانتوں کا صاف رکھنا قیام صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔

مکھی انسان کی قاتل ہے مکھی انسان کی قاتل اس لئے ہے کہ ان جانی دشمنوں کو خفیہ خفیہ ہر وقت انسانوں تک اس طور پر پُہنچاتی رہتی ہے کہ ان بیچاروں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس کی بدولت جراثیم ہر جگہ منتقل ہوتے اور متعدد امراض پیدا ہوتے ہیں اس پر بھی ہماری غفلت عبرت کے قابل ہے کہ اس خطرناک مکھی کی مطلق پروا نہیں کرتے۔

فصل اوّل

مکھی کی حقیقت

مکھیوں کا توالد و تناسل۔ مکھی کی ساخت۔

مکھی پر جراثیم کا انبوہ کثیر مکھی کے ذریعہ امراض کا منتقل ہونا۔ ہماری غفلت اور
اُس کے بُرے نتائج

عوام کے سامنے اگر یہ کہا جائے کہ مکھی امراض اور انسان کی ہلاکت کا سامان مہیا کرتی ہے تو ضرور کہنے والا دیوانہ اور سڑی سمجھا جائیگا۔ کیونکہ خوان نعمت پر مزے مزے کے کھانے چنے ہوتے ہیں تو کس کو خیال ہوتا ہے کہ ان میں مکھیوں نے کیا زہر ملایا ہے اور کس کو گمان ہوتا ہے کہ کھانا معدہ میں پہنچکر اینٹ سے اینٹ بجا کر رہے گا۔ مگر کوئی جانے یا نہ جانے حقیقتہً یہی ہے۔ مکھی ہے بُری ڈرنے کی چیز۔ بچہ سے لیکر بوڑھے تک۔ امیر سے لیکر فقیر تک کسی کو اس کے فتنہ و شر سے امان نہیں اور امان ملے تو آخر کیوں کر ملے اس لئے کہ ہم نے دشمن کو دشمن بھی تو نہیں جانا۔ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ امراض جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں مگر یہ کس کو خبر کہ یہ شیطان اس ظالم پر سوار آتے ہیں۔

مکھیوں کا توالد و تناسل اب ذرا ان مکھیوں کے توالد و تناسل اور نشو و نما کو دیکھئے سڑے گلے پتّے۔ کوڑے کرکٹ اور فضلہ وغیرہ پر مکھی وقت واحد میں کوئی ڈیڑھ سو انڈے دیتی ہے اور یہ انڈے کوئی چار پہر کے اندر ہی اندر کرم بن جاتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ کرم کی صورت پیدا کر لیتے ہیں جو اسی فضلہ میں نشو و نما پاتے ہیں اور کوئی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرنے پاتا کہ ایک اور حالت بدلتے ہیں جس کو شرنقہ کہتے ہیں۔ دوسرے ہفتہ کے بعد دیکھو تو نہ انڈے ہی رہے نہ شرنقہ بلکہ اچھی خاصی مکھیاں بن کر اُڑ گئیں اور ابھی اُڑیں بھی نہ تھیں کہ انڈے بھی دینے لگیں اور پھر وہی دَور و تسلسل جاری ہوگیا۔ اس پورے دَور

کے لئے کسی لمبی چوڑی طول طویل مدۃ کی ضرورۃ نہیں۔ یہ سب مرحلے کوئی دس دن میں طے ہو جاتے ہیں اور ایک ایک مکھی سے کروڑوں مکھیاں پیدا ہوتی ہیں جن میں ہر ایک مکھی ہزاروں بلکہ لاکھوں جراثیم کو ادھر اُدھر منتقل کر سکتی ہے مگر یہ بھی عجب خدا کی قدرت ہے کہ گرما میں تو ان کی یہ گرم بازاری ہوتی ہے سرما پہنچتے ہی ان کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اکثر و بیشتر تو جاں بر نہیں ہوتیں بعض کونوں گوشوں میں کواڑوں چوکھٹوں کی درزوں میں جہاں پناہ ملی موقع کو غنیمت جان کر جان بچا لیتی ہیں اور انھیں سے پھر آگے کو مکھیوں کی نسل بڑھتی ہے اور ہم پر نت نئی مصیبتیں آتی ہیں۔ ان مصائب کا انسداد اگر ہو سکتا ہے تو اسی سے کہ سرما میں مناسب ذرائع مثلاً دھونی وغیرہ سے مکھیوں کا قلع قمع کر دیا جائے۔

مکھی یوں تو ایک جھول انڈے دینے کے بعد بھی مرجاتی ہے مگر عموماً یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر میں کم از کم تین چار جھول انڈے دیتی ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر ایک مکھی جاڑوں میں کہیں نہ کہیں بچ رہی تو موسم گرما میں خوب کھا پی کر انڈے ضرور دیگی اور فرض کیجئے کہ اس نے اپنے موقع سے (۱۵۰) انڈے دیئے اور ان تمام انڈوں سے مکھیاں بھی پیدا ہوئیں اور پھر ان مکھیوں کی جب نوبت آئی تو انھوں نے بھی انڈے دیئے اور ان سے بھی مکھیاں پیدا ہوئیں تو اس طرح سے صرف ایک مکھی سے (۶۴۸۸۵۶۰۰۰۰۰۰) مکھیاں ایک موسم میں پیدا ہو سکتی ہیں اور اگر ایک مکھی ایک جھول کی بجائے تین جھول انڈے دے تو ان کے شمار کے لئے اچھے خاصے ریاضی دان کی ضرورۃ ہوگی۔

اب اگر سرما میں کسی نے ایک مکھی کو مارا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ موسم گرما میں

اتنے کرڑوڑ مکھیوں کو مارا۔ اور مکھیوں کو نہیں مارا بلکہ اُس مرد خدا نے صدہا مخلوق کی جان بچائی۔ کیونکہ ہر مکھی کے ساتھ سیکڑوں کیا معنی ہزاروں اور لاکھوں جراثیم ہوتے ہیں اور ان موذیوں کی نشو ونما اور توالد و تناسل کا یہ حال ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے حد و شمار سے باہر ہو جاتے ہیں اور ایک لشکر کثیر ہماری تباہی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

مکھی کی ساخت مکھی کے اعضا اور جسمانی ساخت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ اس کے کاروبار کے لئے نہایت ہی موزوں اور مناسب ہیں۔ مگر کمبخت کے کاروبار ہی کچھ ایسے انسانوں کے لئے خطرناک واقع ہوئے ہیں کہ الحذر والاماں۔ گندہ سے گندہ مقامات اس کے مسکن ہوتے ہیں۔ غلیظ سے غلیظ چیزیں اس کی غذائیں ہیں۔ پیدا بھی ہوتی ہے تو متعفن چیزوں سے اور پرورش بھی پاتی ہے تو انھی ماحول میں۔ اس کا منہ اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس سے صرف چوسنے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ دوسری قسم کی مکھیوں کی طرح نیش زنی کی توقع اس سے نہیں۔ اس کے چھ پانوں اور ہر پانوں میں دو دو انگلیاں ہوتی ہیں اس کے علاوہ ہر ایک پانوں میں ایک بہت چھوٹا سا تکیہ لگا ہوتا ہے جس پر بہت سے مہین بال ہوتے ہیں اور جس میں سے چپچپا سا مادّہ نکلتا رہتا ہے اوپر سے نیچے اُترنے اور صاف چکنی سطح پر چلنے پھرنے میں اس سے اس کو بیحد مدد ملتی ہے۔ اس کے جسم پر بال اس قدر ہوتے ہیں کہ خُردبین سے دیکھنے میں بالکل بھدی اور مکروہ سی نظر آتی ہے۔ مکھی کی ساخت اور ہیئت کا بغور معائنہ کرنے کے بعد صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ کس طرح امراض کے جراثیم اس کے ذریعہ چاروں طرف منتشر ہوتے ہیں۔

شرنقہ کی حالت سے جب مکھیاں قالب بدلتی ہیں تو پہلے تو خوب جی بھر کر سڑی گلی گندہ اور متعفن اشیاء سے پیٹ بھر لیتی ہیں۔ پھر اُن ہی گندہ مقامات میں جہاں جراثیم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی انڈے دیتی ہیں اور انڈے دے دلا کر ان کا قافلہ گھروں میں پہنچتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ مکھیاں چلی آرہی ہیں اور اس کی خبر نہیں ہوتی کہ ان کے ہمراہ ہمارے قاتل ایک نہیں ہزاروں گھر میں گھس پڑے۔ کیونکہ ایک ایک مکھی لاکھوں جراثیم کو بلا تکلف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتی ہے اور جس گندگی سے ملوث ہو کر نکلتی ہے اگر اس میں امراض کے جراثیم ہوں اور نہونا تعجب ہے تو پھر ان کے قافلے کے قافلے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔

مکھی پر جراثیم کا انبوہ کثیر گھر اور بازاروں میں ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ ماکولات اور مشروبات پر مکھیاں بھنبھناتی اور ٹوٹی پڑتی ہیں۔ اس سے ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ امراض کے جراثیم کا ہمارے کھانے پینے کی چیزوں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی مکھیاں ہیں۔ اسی وجہ سے سائنس والوں نے کہا کہ لاؤ۔ مکھی کو خردبین سے دیکھیں اُنھوں نے نہ صرف مکھی کو دیکھا بلکہ جراثیم کا شمار کرنا بھی شروع کیا تو اکثر و بیشتر مکھیوں کے ہر ہر عضو پر درجن سے لیکر ہزاروں تک جراثیم پائے گئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ مکھی جہاں سے گزرے ذرا اس کو بھی دیکھ لیں۔ پھر خردبین اُٹھائی اور دیکھنے لگے تو خدا کی پناہ اُس کے قدم قدم پر جراثیم کے کارواں پائے گئے جن کا یہ حال کہ ذرا سی مہلت میں سیکڑوں کے ہزاروں ہو جائیں۔ اسی طرح سے مکھی کو دودھ وغیرہ میں ڈبو کر

متعدد تجربے کئے گئے جن سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مکھیوں کو گھر میں جگہ دینی سینہ پر سانپ کو پالنا ہے جس سے اپنی اور دوسروں کی جان ہمیشہ خدشہ میں پڑی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں مریض دم توڑتے ہوں ان کے گرد وپیش متاثر اشیاء اور غلاظت پر مکھیاں ٹوٹ پڑتی ہیں اور خوب کھا پی کر اور ان میں ملوث ہو کر جب لوٹتی ہیں تو جہاں کہیں کوئی دریچہ کھلا پایا داخل ہو گئیں اور سیدھے دسترخوان یا باورچی خانہ میں کھانے پینے کی چیزوں پر دم لیا جس سے یہ نہ صرف ان کو غلیظ اور نجس کرتی ہیں بلکہ امراض کے جراثیم کو چپ چاپ ان میں ملا دیتی ہیں کہ لو آنکھیں بند کر کے مزے مزے سے کھاؤ اور تڑپ تڑپ کر جان دو۔

مکھی کے ذریعہ امراض کا منتقل ہونا

متعدی امراض کے منتقل ہونے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ کہیں کوئی مریض پڑا ہوتا ہے تو مکھیاں اس کے آس پاس متاثر اشیاء پر بھنبھناتی رہتی ہیں اور جراثیم ان پر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے میں کسی باورچیخانہ سے ہوا کا جھونکا آئے تو مکھیاں سمجھتی ہیں کہ بلاوا آیا۔ فوراً چل کھڑی ہوئیں اور مرض کے جراثیم کو ہمسایہ کے گھر میں منتقل کر دیا۔

مکھی اس کی بالکل محتاج نہیں کہ اشیاء خوردنی رقیق اور سیال ہی ہوں۔ خشک چیزوں کو وہ اپنے لعاب دہن سے مرطوب کر لیتی ہے اور پھر چوس لیتی ہے قند یا مصری کی ڈلی پر جب مکھی بیٹھی ہو تو خردبین سے اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ مکھی اس میں کلام نہیں کہ گندہ اور گندگی میں ملوث ہونے والی ضرور ہے مگر جب عفونت سے نکل کر گھروں میں داخل

ہوتی ہے اور ہمارے کھانے پینے کی اشیاء پر بیٹھتی ہے تو اس وقت اس کو کچھ صفائی کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ ملوث بدن سے کثافت جھاڑتی ہے تو جراثیم کی چاروں طرف بوچھار ہوتی ہے جو ہمارے جزوِ طعام بن جاتے ہیں۔

جراثیم کے منتقل ہونے کی ایک اور مثال دیکھئے کہ ننھی سی جان دنیا و مافیہا سے بے خبر میٹھی نیند جھولے میں سو رہی ہے اور ظالم مکھی ام الصبیاں کے جراثیم سے بھری ہوئی اس کے نازک ہونٹوں پر بیٹھ گئی۔ اب جراثیم اس کے کام و دہن پر نہ آجائیں تو کیا ہوں۔ ادھر جراثیم پہنچ گئے اُدھر دایہ نے بچے کے جاگتے ہی دودھ پلا دیا۔ اتنی سی جان اس کو کیا خبر کہ کیا ہونے والا ہے۔ ہمک ہمک کر دودھ پی لیا اور ان جراثیم کا انبوہ کثیر معدہ میں پہنچ کر اس کی جان کے درپے ہو گیا۔ غرض ذرا ذرا سی بے احتیاطیوں سے دشمن کو موقع مل جاتا ہے اور مکھیوں کا تو صبح سے شام تک دھندا ہی ہے کہ انسانوں کے حق میں کانٹے بویا کریں۔ یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے کہ ہم نے تمام مخلوقات کو زیرنگیں کر لیا حقیقۃً یہ ہے کہ ان مکھیوں اور جراثیم سے خود انسانوں کو مفر نہیں۔ ان کے مقابلہ سے ہم عاجز ہیں اور اسی طرح سے عاجز رہیں گے جب تک کہ غفلت کی پٹیاں آنکھوں پر بندھی کی بندھی رہیں۔

ہماری غفلت اور اُس کے بُرے نتائج

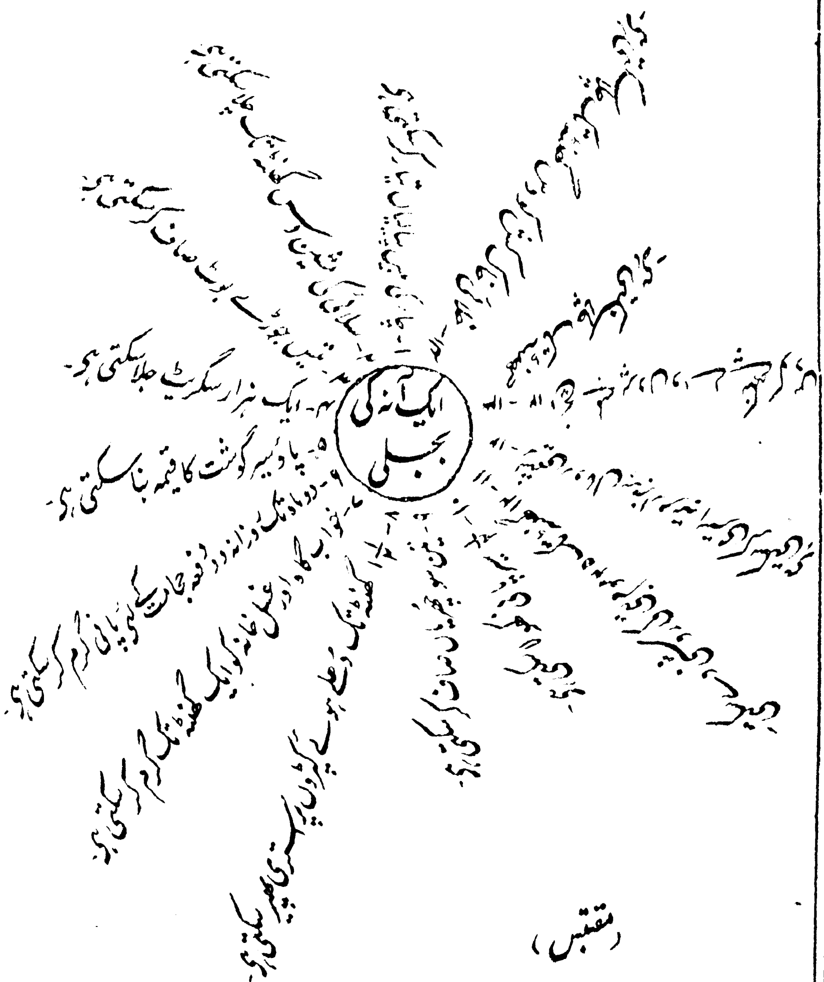
زندگی کی شاہراہ پر غور سے دیکھئے تو قدم قدم پر تباہی و بربادی کے دام بچھے ہوئے ہیں۔ یہاں تو ضرورۃ اس کی ہے کہ انسان پھونک پھونک کر قدم رکھے ورنہ اس کا سلامتی کے ساتھ منزل مقصود اور عمر طبعی کو پہنچنا معلوم۔ اور بدقسمتی سے ہوتا بھی یہ ہے کہ بہت سے غنچے کھلنے بھی نہیں پاتے کہ مرجھا جاتے ہیں

سیکڑوں اور ہزاروں ماں باپ کے دلوں پر جگر گوشوں کے عالم طفولیت میں چل بسنے کی چوٹ ہوتی ہے اور بہت سے ایسے بھی ملینگے کہ ان کو نوجوان اولاد نے بڑھاپے میں ایسا داغ دیا کہ مدتوں تک رہ رہ کر جگر میں ٹیس اٹھتی ہے۔ اس بے وقت کے موت کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو یہی کہ مائیں جن کی گودیوں میں بچے پرورش پاتے ہیں حفظ صحت کے اصول سے عموماً بے بہرہ اور نابلد ہوتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے چشم و چراغ گودیوں سے اتر کر چلنے پھرنے لگے بھی تو ہاتھ پانوں کے ایسے کمزور اور قوی کے ایسے منحنی کہ دفاع مضرات کی قوۃ ان کے امکان سے باہر۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کا ہر ایک کام بے ڈھنگا۔ کھانا پینا۔ سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا سب بے وقت اور بے ترتیب۔ بے اصولی زندگی کا ادھر یہ حال ادر ادھر مکھیوں اور جراثیم کا لشکر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوا۔ نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی بی بی شوہر چین سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ اتنے میں بی بی کا ساتھ چھوٹا اور شوہر جگر تھامے رہ گیا۔ ننھے ننھے بچوں کی آنکھوں سے ابھی آنسو خشک ہونے نہ پائے تھے کہ باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اکثر گھرانوں اور کنبوں میں اس قسم کے حادثے ہوتے رہتے ہیں اور ایسے درد ناک واقعات پیش آتے ہیں کہ پتھر کا دل بھی پسیج جائے۔ اس میں نہ کوئی قسمت کا قصور اور نہ قدرت پر الزام۔ قوانین قدرت تو منضبط ہیں۔ ان کے خلاف چلو تو سزا بھی بھگتو۔ حفظ صحت کے اصولوں کو نظر انداز کردو گے تو ضرور کمزور اور نحیف ہوگے اور دفاع مضرات کی قوۃ لامحالہ گھٹ جائیگی۔ پھر اگر غنیم نے موقع پاکر حملہ کردیا تو حواس گم اور اوسان خطا ہوگئے مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

محمد اللہ (حیدرآبادی)

سائنٹفک نوٹ

(۱) ایک آنہ کی بجلی کیا کیا کر سکتی ہے؟



(مقتبس)

فیروز دین مراد

(ب) ایمونیا کے خانگی استعمالات

۱- چکنائی کے داغ ایمونیا کے ہلکے محلول سے بآسانی اُڑائے جاسکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے کپڑے کے اوپر نرم سفید کاغذ رکھ کر گرم استری سے دبا دینا کافی ہے۔

۲- ریشمی پارچہ جات پر سے پھلوں کے دھبے ایمونیا کے ذریعہ سے بآسانی چھڑائے جاسکتے ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ اس عمل سے ریشم کا اصلی رنگ بھی نہیں بگڑتا۔

۳- ہر ایک قسم کا پیتل کا سامان، برتن، آلات، وغیرہ تیز ایمونیا ڈال کر بزور رگڑنے سے نئے کی مانند صاف اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔

۴- شیر گرم پانی میں تھوڑا سا ایمونیا ڈال کر نہانے سے جلد صاف اور نرم رہتی ہے۔

۵- دروازوں اور کھڑکیوں کے آئینے ایمونیا ملے پانی سے دھونے سے خوب صاف کئے جاسکتے ہیں۔

۶- نکل کے ملمع کا سامان اور نقرئی زیورات اونی کپڑے کو نوسادر کے محلول سے بھگو کر رگڑنے سے خوب نکھر جاتے ہیں۔

۷- نوسادر سونگھنے سے دردِ سر کو افاقہ ہو جاتا ہے۔ نوسادر ایمونیا اور کلورین گیس کا ایک کیمیائی مرکب ہوتا ہے جو علاوہ دیگر استعمالات کے سیملنگ سالٹ یعنی سونگھنے کے ملحیات میں (جو بحالتِ غشی ہوش میں لانے اور حواس قائم رکھنے کے لئے بالعموم کام آتے ہیں) دوسری خوشبودار چیزوں کے ساتھ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔

۸ ۔ مختلف اقسام کے کیڑے اور بھنگے جو ننھے پودوں کی جڑیں کھا جاتے ہیں پودوں پر ایمونیا کے بہت ہلکے محلول سے چھینٹے دینے اور سیراب کرنے سے مرجاتے ہیں۔

۹ ۔ سلائی کی مشین سے نئے سفید کپڑوں پر جو بدنما داغ پڑ جاتے ہیں بذریعہ ایمونیا صاف کئے جاسکتے ہیں۔

۱۰ ۔ فرش فروش کے جھاڑنے پونچھنے کے لئے اگر جاروب یا جھاڑن کو ایمونیا سے بھگو لیا جائے تو نتیجہ بہت خوشگوار ہوتا ہے یعنی علاوہ[1] ہوا کی صفائی کے فرش اور قالین خوب مصفا نظر آتے ہیں۔

احتیاط ۔ چونکہ ایمونیا کے تیز محلول میں سے ہر وقت ایمونیا گیس خارج ہوتی رہتی ہے اور یہ گیس آنکھوں کے لئے مضر ہے اس لئے ایمونیا سے کام کرتے وقت بالعموم اور ایمونیا کی بوتل کھولتے وقت بالخصوص ناک اور آنکھوں کی حفاظت رکھنی لازمی ہے۔

ایمونیا دراصل ایک غیر مرئی بودار گیس کا نام ہے جو بآسانی پانی میں جذب ہوجاتی ہے۔ ایسے پانی کو ایمونیا کا محلول یا عرف عام میں مختصراً ایمونیا ہی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ عنوان میں لفظ ایمونیا سے مراد ایمونیا گیس کا آبی محلول ہے۔

کسی خاص مقدار پانی میں جذب شدہ ایمونیا گیس کی کمی بیشی سے نام نہاد ایمونیا

---

[1] جاپانی سمیلنگ سالٹ کی شیشی کے اوپر منجملہ دیگر ہدایات کے یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ شیشی کا منہ تھوڑی دیر کے لئے کھلا رکھنے سے کمرہ کی ہوا صاف پاکیزہ اور خوشبودار ہوجاتی ہے۔

کو ہلکا یا تیز محلول کہتے ہیں۔ اگر محلول کا درجۂ حرارت کم ہو تو گیس کی فراواں مقدار جذب ہو سکتی ہے لیکن حرارت کی زیادتی سے جذب شدہ گیس خارج ہونی شروع ہو جاتی ہے، بعینہ جس طرح محلول کاربانک ایسڈ گیس، سوڈا واٹر میں سے بوتل کھلنے پر بمقدار کثیر (بیرونی دباؤ کی کمی کے باعث) نکلتی ہے لیکن اگر سوڈا واٹر میں برف ڈال کر اسے ٹھنڈا کر لیں تو محلول گیس اتنی جلد خارج نہیں ہوتی۔

مراد

تحفۂ سائنس

یعنی

عام فہم اور دلچسپ سائنٹفک مضامین کا مجموعہ

مصنفہٗ

شیخ فیروزدین صاحب مراد بی اے۔ ایم ایس سی

پروفیسر علوم طبیعات محمڈن کالج علی گڈھ

جس میں

علمی مضامین کے علاوہ جو تازہ ترین تحقیقات پر مبنی ہیں پورے ایک جزد کی مفید فرہنگ مصطلحات بھی شامل ہے۔ ضخامت تقریباً چارسو صفحات ہی اور عمدہ سفید کاغذ پر نفاست سے اہتمام کے ساتھ طبع ہوئی ہے قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنہ۔ کتاب مذکور مصنف سے مل سکتی ہے۔

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ کی آخر تاریخ کو دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سے شایع ہوگا

(۲) رسالہ کا حجم تقریباً تین جزو کا ہوگا اور ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپیگا

(۳) سالانہ قیمت صرف تین روپیہ مقرر ہے جو بنام رجسٹرار صاحب محمدن کالج علی گڑھ بھیجنا چاہیئے۔ منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کردی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے۔

(۴) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہاں منزل، علی گڑھ ہونا چاہیئے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری جائنٹ سکرٹری آل انڈیا

محمدن ایجوکیشنل کانفرنس و آنریری اڈیٹر کانفرنس گزٹ

نمبر ۲ — مئی سنہ ۱۹۱۸ء

جلد اوّل — مطابق شعبان سنہ ۱۳۳۶ھ

کانفرنس گزٹ

یعنی

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس

(شیخ فیروز دین مراد پروفیسر آف فزکس علی گڑھ کالج نے مضامین سائنس لکھے اور ترتیب دیئے)

خلاصہ مباحث:

(۱) حصہ اوّل۔ کانفرنس اور اسلامی درسگاہوں کے حالات ۸۹

(۲) حصہ دوم۔ مفید تعلیمی معلومات

(۳) حصہ سوم۔ سائنس یا علوم جدیدہ

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج میں طبع ہوا

اور صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ سے شایع کیا

مفصل فہرست مضامین

حصّہ اوّل

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس اور اسلامی درسگاہوں کے حالات

حصّہ دوم

تربیت اطفال - ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور صنعتی تعلیم کے متعلق مفید معلومات

حصّہ سوم

سائنس یا علوم جدیدہ

کانفرنس گزٹ

حصۂ اوّل

بزرگانِ قوم اور حامیانِ تعلیم کی خدمت میں ضروری التماس

بمقابلہ ہندوستان کی دوسری ہمسایہ اقوام کے تعلیم میں مُسلمانوں کے بہت پیچھے رہ جانے کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ بھی ہو کہ مسلمانوں نے سرکاری مدارس کی سادہ تعلیم کو جو مذہبی تعلیم سے معرّا ہے اپنی اولاد کے لیے ناکافی سمجھکر اُنھیں ان مدارس میں داخل کرنے میں پس وپیش کیا۔ اور اس اُدھیڑبن میں مصروف رہے کہ مسلمانوں کے اپنے جداگانہ قومی مدارس ہوں جن میں مذہبی تعلیم و تربیت

کا بھی انتظام ہو مگر باوجود اس کے کہ فقدان تعلیم مذہبی کا احساس عام مسلمانوں کو شروع سے ہی سالہا سال کی کوششوں سے ہندوستان کے مختلف حصص میں گنتی کے چند قومی اسکول اس وقت تک قایم ہو سکے جن میں سے ابھی اکثر کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ ہمارے مقابلہ میں دوسری قومیں لاکھوں کی تعداد میں نہایت خاموشی کے ساتھ سرکاری مدارس کی سادہ تعلیم سے مستفید ہو رہی ہیں اور اس تعلیم سے اُن میں ہزار وکیل اور صیغہ مال و دیوانی و فوجداری و دیگر محکمہ جات کے عہدہ دار اور لاکھوں کلارک تیار ہو کر تمام سررشتوں کو اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ اور اسی سادہ تعلیم سے اُن میں بڑے بڑے مقرر، نامہ نگار، مصنف اور ملک و قوم کے جاں نثار تیار ہو رہے ہیں جنھوں نے اپنی جماعت میں قومی روح پھونک دی ہے۔ گو سادہ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم و تربیت کے انتظام کرنے کا خیال بذات خود ایک عمدہ اور پاکیزہ خیال ہے بشرطیکہ مسلمانوں میں اس خیال کو عملی شکل میں لانے کی ہمت اور قوت ہو مگر جس رفتار سے یہ خیالات عملی شکل میں آ رہے ہیں اُس کے اعتبار سے مسلمانوں پر تاتریاق از عراق کی مثل صادق آتی ہے۔ اس لیے مسلمان تعلیم یافتوں کی تعداد میں نمایاں کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ علاوہ قومی کالجوں اور اسکولوں کے قایم کرنے کی ہم اپنی قوت کا بڑا حصہ سرکاری مدارس میں تعداد طلبہ بڑھانے میں صرف کریں اور اس کے لیے مناسب ذرایع اور وسائل سوچکر اُن پر عملدرآمد کریں۔ اور سال بسال اندازہ کرتے رہیں کہ اس ذریعہ سے ہم نے انگریزی پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کہاں تک بڑھا دی۔ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ صوبجات ممالک متحدہ میں اسکولوں کا سال ختم ہو چکا ہے اور یہ گرمیوں کی تعطیلات کا زمانہ ہے۔ جولائی میں مدرسے کھلینگے لہذا اب عین وقت ہے کہ تمام مسلمان عموماً اور لوکل کمیٹیاں اور اسلامی انجمنیں خصوصاً اس طرف متوجہ ہوں کہ اسکول کھلتے ہی وہ اپنے اپنے زیر اثر بچوں کو کثرت سے سرکاری اسکولوں میں داخل کرائیں

نیز دیگر صوبجات کے بزرگوں کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ اسکولوں کا نیا سیشن شروع ہوتے وقت اس کام کی انجام دہی میں خاص تدابیر ہر جگہ اختیار کی جائیں۔ سفیران کانفرنس کو بھی خاص طور پر ہدایت ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں کوشش کر کے بہ کثرت مسلمان بچوں کو سرکاری وامدادی ومشن اسکولوں میں جہاں جگہ ملے داخل کرانے کی کوشش کریں چنانچہ اس کام کو مختلف سفیر مختلف مقامات پر پوری سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ غیر مستطیع ہیں اُن کے بچوں کو لوکل چندہ سے فیس دے کر مختلف مدرسوں میں داخل کرایا جائے اور اس ضرورت کے لیے وظائف فنڈ مختلف مقامات پر قایم ہوں۔ سکرٹری صاحبان لوکل کمیٹی ہائے کانفرنس وانجمن ہائے اسلامی کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس استدعا پر توجہ فرما کر جس قدر طلبہ کو وہ سرکاری سکولوں میں داخل کرائیں اُن کی تعداد اور کیفیت حصول امداد فیس وغیرہ سے خاکسار کو بھی مطلع فرمائیں تاکہ کانفرنس گزٹ میں یہ حالات شایع ہو کر دوسروں کے لیے ترغیب کا باعث ہوں۔

سفیران کانفرنس کی رپورٹوں اور کارگزاریوں کے خلاصے

جن اضلاع میں سفیرانِ کانفرنس پچھلے دو مہینوں سے تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اُن کے کام کی جو رپورٹیں دفتر میں پہنچی ہیں اُن کا اقتباس بہ غرضِ عام آگاہی اور بالخصوص اُن اصحاب کی اطلاع کی غرض سے جن کے ضلع میں سفیرانِ کانفرنس کام کر رہے ہیں درج کیا جاتا ہے تاکہ مقامی با اثر حضرات سفیرانِ کانفرنس کے کام کی نوعیت اور اہمیت اور اپنے ضلع کی تعلیمی ضرورتوں سے واقف ہو کر اس مفید کام کی طرف توجہ فرمائیں اپنے اثر کو کام میں لائیں اور اپنی کوششوں کو وسیع کر کے اپنے اپنے ضلع میں اشاعت تعلیم کے کام کو اس زمانہ کا نہایت ثواب کا کام سمجھ کر انجام دینے کی کوشش فرمائیں، جن سے

ان کے ضلع کے مسلمانوں کی ہر قسم کی بہبودی وابستہ ہے۔

ضلع فرّخ آباد

صوبہ ممالک متحدہ میں ضلع فرخ آباد اپنی گزشتہ تاریخ اور مسلمانوں کی ممتاز آبادی کی حیثیت سے خاص امتیاز رکھتا تھا جس میں جابجا مسلمان شرفا کی آبادیاں اب تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، جو ایک مدّت تک حکومت اور طاقت کا مرکز رہ بھی چکا ہے۔ لیکن آج تمام ضلع میں جس قسم کی خستہ حالی اور تعلیم کی طرف سے عدم توجہی وہاں نظر آتی ہے مثل اس کے شاید کسی اور ضلع میں مسلمانوں کی جہالت، ان کی پستی اور افلاس کی نظیر مل سکے۔

منشی محمد ناظم صاحب سفیر دو مہینے سے اس ضلع میں کام کر رہے ہیں۔ سرکاری نقشوں اور رپورٹوں سے اس ضلع کے مسلمانوں کی آبادی اور تعلیمی کیفیت کے جو اعداد اُنھوں نے ہم پہنچائے ہیں وہ نہایت افسوسناک ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

ضلع فرخ آباد میں مسلمانوں کی تعداد ۱۳ فیصدی سے کسی قدر زائد ہے۔ رپورٹ مردم شماری سنہ ۱۹۱۱ع کی رو سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا اوسط چار فی صدی ہے جس میں کہ اس وقت کے تعلیم پانے والے بچے اور ایسے لوگ بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو محض اپنا نام لکھ لینا جانتے تھے یا کچھ شدھ بدھ رکھتے تھے۔ موجودہ تعلیمی رفتار کا اندازہ ان ان تازہ اعداد سے کیا جا سکتا ہے جو ۳۱۔ مارچ سنہ ۱۹۱۸ع کے سالانہ نقشہ جات سے لیے گئے ہیں۔ یہ اعداد ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدارس کے ہیں جن میں ابتدائی کلاسوں سے لیکر مڈل کلاسوں تک کے تعلیم پانے والے طلبا کے نام ہیں۔ چونکہ مذکورہ بالا نقشہ ہنوز نامکمل ہے اس لیے مڈل کلاسوں، لوئر پرائمری اور اپر پرائمری کلاسوں کے طلباء کا تجزیہ نہیں ہو سکا۔ آئندہ اس کی تفصیل کی جاویگی جس سے معلوم ہوگا کہ درجات مڈل میں مسلمان طلبا کی کیا نسبت ہے۔

تحصیل قنوج میں قابل تعلیم اطفال میں سے (۲) فی صدی مسلمان بچے تعلیم پا رہے ہیں

اور (۱۱) فیصدی اہلِ ہنود پڑھ رہے ہیں۔
تحصیل فرخ آباد میں (۳) فیصدی مسلمان اور (۲۷) فیصدی ہنود۔ تحصیل نرواہیں (۱) فیصدی مسلمان اور (۱۱) فیصدی ہنود۔ تحصیل چھبرامئو میں (۲) فیصدی مسلمان (۲۷) فیصدی ہنود۔ تحصیل قایم گنج میں (۳) فیصدی مسلمان (۱۰) فی صدی ہندو۔ تحصیل علی گنج میں مسلمان فیصدی ندارد ان کے مقابلہ میں (۱۲) فیصدی ہندو۔
کُل ضلع کی مجموعی حالت یہ ہی کہ سو مسلمان قابلِ تعلیم اطفال میں سے صرف ایک لڑکا ڈسٹرکٹ بورڈ کے مدارس میں تعلیم پا رہا ہی اور اس کے مقابلہ میں (۱۰۰) قابلِ تعلیم اطفال میں (۱۰) ہندو لڑکے پڑھ رہے ہیں۔ اگر اس تعداد میں چمار بھنگیوں وغیرہ کی ادنیٰ ذاتوں کو خارج کر دیا جائے جن کا کام پڑھنا پڑھانا نہیں ہی تو پچیس گنی زیادتی نظر آئیگی۔ گورنمنٹ رزولیوشن مورخہ ۲۵۔ اگست ۱۹۱۴ء کی متابعت میں اس ضلع کے ڈسٹرکٹ بورڈ نے اب تک صرف (۳) مکاتب کو امداد دی ہی۔ اور (۴) اسپیشل اسلامیہ اسکول کھولے ہیں ۔۱۳۔ دسمبر ۱۹۱۷ء سے مکتب کمیٹی کا کوئی جلسہ نہیں ہوا (یہ مسئلہ ممبر صاحبان اور بالخصوص چیرمین صاحب کمیٹی کی سخت توجہ کا محتاج ہی)
سفیر صاحب کانفرنس کی کوشش سے انجمن رفیق الاسلام فرخ آباد کی ایک شاخ بہ طور لوکل کمیٹی کانفرنس فتح گڑھ میں قایم ہوئی۔ مولوی محمد ایوب صاحب صدیقی بی اے وکیل اس کے سکرٹری قرار پائے اور اس کمیٹی نے ضلع مذکور میں اشاعتِ تعلیم کا کام اپنے ذمہ لینا قرار دیا ہی۔ کمیٹی نے سید عبدالستار صاحب کا تقرر سفارت کے کام پر اس لیے کیا ہی کہ وہ تمام ضلع میں پھر کر اشاعت تعلیم کا کام انجام دیں گے۔ اور غریب طلبا کی فیس اور کتابوں کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کر دینگے۔
سفیر کانفرنس کے ذریعہ سے (۱۸) درخواستیں مختلف دیہات اور قصبات سے

اجراء اسپیشل اسلامیہ اسکولوں اور امداد مکاتب کے لیے بھجوائی گئی ہیں مولوی محمد ایوب صاحب صدیقی مولوی سعادت مندخاں صاحب مختار، منشی امیرعلی خاں صاحب رئیس اور زین العابدین صاحب منصرم حجی نے سفیر کانفرنس کو مدد دی جو قابل شکرگزاری ہی، مگراس افسوسناک کیفیت کے مقابلہ میں اور اس تعلیمی افلاس کی حالت میں صاحبان موصوف کی مزید اور مستقل توجہ کی ضرورت ہی۔ مقابلہ کی عظیم الشان رو سے اگرچندے غفلت اور برتی گئی تو مسلمانان فرخ آباد کا مرض لاعلاج ہو جائیگا۔ خدا ایسا دن نہ لاوے

ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں سید مظفر حسین صاحب سفیر کئی سال سے مقاصد کانفرنس کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔ پٹنہ اور بانکی پور مسلمان تعلیم یافتوں کا مرکز سمجھا جاتا ہی لیکن افسوس ہی کہ اس وقت تک وہاں کے مسلمانوں کے پاس کوئی ایسی مرکزی قوت نہ تھی جو صوبہ بہار کے مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کو ایک اُصول اور نظام کے ماتحت حرکت میں لاتی رہتی۔

خدا کا شکر ہی کہ سفیر موصوف کی کوشش سے وہاں ایک "پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے قیام کی تجویز عملی شکل اختیار کرنے کے قریب قریب آرہی ہی۔ ۱۹۔ اپریل کو کانفرنس باضابطہ طور پر قایم ہوگئی۔ عنقریب ایک عام اور بااثر جلسہ ہونے والا ہے جس میں صوبہ بہار کے تمام اکابر کے شریک کیئے جانے کی کوشش ہو رہی ہی۔ اس کے ساتھ ایک اسلامی پریس اور اخبار کی داغ بیل بھی ڈالی گئی ہی۔ افسوس ہی کہ صوبۂ بہار میں اس وقت تک نہ کوئی اسلامی پریس ہی اور نہ کوئی اخبار۔ جس قوم کے پاس اس زمانہ میں پریس کی طاقت نہیں ہی، ظاہر ہی کہ اس ملک میں اس کا کیا درجہ ہی اور آیندہ کیا ہونے والا ہے۔

پریس اور اخبار کا سرمایہ پچھتر ہزار روپیہ قرار پایا ہی جو دس دس روپیہ کے حصوں میں منقسم ہوگا "بورڈ آف ڈائرکٹرس" کا انتخاب ہو چکا ہی بعض مخیر اور ہمدرد اصحاب نے اس ضرورت کو محسوس کر کے معقول طور پر عطیہ جات کے وعدوں سے

ہمت افزائی کی ہے۔ پریس اور اخبار کے متعلق بھی عام جلسہ میں ضروری امور بعد مشورہ طے ہوں گے۔ سفیر کانفرنس کی خدمات پراونشیل کانفرنس کو دو مہینے کے واسطے سپرد کی گئی ہیں جنہوں نے اپنے فرائض کو قابلیت اور مستعدی کے ساتھ انجام دیا ہی۔

مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل میں آنریبل مسٹر سید سلطان احمد صاحب گورنمنٹ ایڈوکیٹ مسٹر سید عبدالعزیز صاحب بیرسٹر۔ مسٹر سید یوسف حسن صاحب بی اے۔ مسٹر سید احمد شرف الدین صاحب۔ نواب سید سرفراز حسین خاں صاحب۔ مسٹر سید وصی احمدؐ صاحب۔ حافظ سید محب الحق صاحب۔ خان بہادر سید ضمیر الدین صاحب۔ سید محمدؐ اسمٰعیل خاں صاحب۔ محمد حسن خاں صاحب وکیل کی گرانمایہ توجہات کا بہت بڑا حصہ ہی اگر پراونشیل کانفرنس کا قیام مضبوط طور پر ہوا (اور انشاء اللہ ہوگا) اور مجوزہ اخبار سنجیدہ اصولوں کے ساتھ چلایا گیا اور تعلیمی تحریک و اشاعت کے کام میں اس سے مدد لی گئی تو وہ دن دور نہیں کہ مسلمانان بہار کی ترقی کا نیا زمانہ شروع ہوگا اور وہ تمام بزرگ جو اس مفید مقصد کے حصول میں کوشاں ہیں، آنے والی نسلیں ان کی عمدہ کوششوں کو اور اُن کے محترم ناموں کو ہمیشہ عزت اور وقار کے ساتھ یاد رکھیں گی۔

ضلع جالندھر

سید فیض الحسن صاحب سفیر کی خدمات انجمن اسلامیہ جالندھر کو تین مہینے کے واسطے دی گئیں۔ سفیر موصوف نے تقریباً دو مہینے کے عرصہ میں ایک کام تو داخلہ طلبہ کے متعلق انجام دیا، دوسرا کام یہ کیا کہ انجمن دسوہہ ضلع ہوشیارپور کی سرپرستی میں جو مڈل اسکول قائم ہے اور جس کی بوجہ ناکافی اسٹاف اور بوجہ عدم سرمایہ نازک حالت ہی اوس کو تقویت دینے میں مدد دی۔ اسی طرح انجمن اسلامیہ جالندھر کی سرپرستی میں جو ہائی اسکول قائم ہے اوس کی اصلاح اور مدد میں حصہ لیا۔ چنانچہ ضلع جالندھر کی تین تحصیلوں میں دورہ کرکے اُنہوں نے (۱۸) درخواستیں نارمل سکول کے داخلہ کے واسطے بھجوائیں۔ اسلامیہ ہائی اسکول جالندھر کے سکنڈری درجوں میں (۴۵)

طلبا انکی کوشش سے داخل ہوئے۔ اسکول کا اسٹاف قواعد سررشتہ تعلیم کے مطابق نہیں تھا (۲) اوستادوں کو ٹرننگ کالج میں جانے کی ترغیب دی اور اُن سے درخواستیں بھجوائیں اور آخر اپریل تک اسکول کا تمام اسٹاف مطابق ضابطہ سررشتہ تعلیم مکمل کر لیا گیا دو اوستا د بی اے، بی ٹی ہیں ایک بی اے، ایس اے دی۔ اور باقی تمام ٹیچر ٹرینڈ ہیں۔ اسلامیہ ہائی اسکول کے ماتحت برانچیں جن میں پرائمری درجوں کی تعلیم ہوتی تھی شہر جالندھر کے دو مختلف حصّوں میں قائم تھیں تیسری شروع اپریل میں قائم ہوئی اور آخر اپریل تک اس میں پچاس طلبہ داخل ہو گئے باقی سابقہ شاخوں میں بھی طلبہ کا اضافہ ہوا۔

اس کے علاوہ (۵) طلبہ گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر میں (۹) طلبہ ڈسٹرکٹ بورڈ پرائمری اسکول میں اور (۱۱) طلبہ نارمل اسکول کی پرائمری جماعتوں میں داخل کرائے۔

(۵) طالب علم ایسے تھے جو میٹرک میں فیل ہو چکے تھے اور جن کی عمر ۲۰ سال سے متجاوز ہو گئی تھی اور جن کا داخلہ بغیر اجازت انسپکٹر صاحب سررشتہ تعلیم اسکول میں نہیں ہو سکتا تھا، اُن کے داخلہ کی کوشش کی اور اُن میں سے تین طالب علم داخل کر لئے گئے۔

مڈل اسکول دوسوہہ کے واسطے (۶) اوستاد ٹرینڈ مقرر کرائے ایک گریجوایٹ ہیڈ ماسٹر کی تقرر کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مڈل ڈیپارٹمنٹ میں (۱۱) طلبہ کا اور پرائمری درجہ میں (۵) طلبہ کا اضافہ کرایا۔

ماہ حال میں انجمن کا جلسہ ہونے والا ہے جس میں مالی حالت کو تقویت دینے کی کوشش پیش نظر ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع سے مل کر اسکول کی مدد کی جانب ان کو توجہ دلائی۔ صاحب موصوف نے بذات خود مدرسہ کا معائنہ فرمایا اور ایک جلسہ میں مسلمانان شہر کو ترغیب دیتے ہوئے مدرسہ کے استحکام پر متوجہ کیا۔ اسکول کے ایک انٹرنس پاس ٹیچر کو ٹرننگ کالج کے داخلہ کی ترغیب دی اور وہ کالج مذکور میں داخل ہو گئے۔

ٹریننگ کالج میں (۴) طالب علم اور نارمل اسکول میں (۱۱) طالب علم سفیر مذکور کی کوشش اور ترغیب سے داخل ہوئے۔

اسلامیہ ہائی اسکول جالندھر کے سرمایہ کی ترقی اور وظائف فنڈ کے اضافہ کی کوشش کی گئی ۳۰ مارچ کو انجمن کے جلسہ میں سفیر مذکور نے اسکول کی ضروریات کو مقامی اصحاب کے سامنے پیش کیا۔ ان کی کوشش اور تقریر سے جلسہ کو بڑی مدد ملی جس قدر نقد چندہ وصول ہوا اور جس قدر رقم کے وعدے ہوئے اوس کی مجموعی تعداد مبلغ پانچہزار روپیہ تک پہنچتی ہے۔ جب سے انجمن قایم ہوئی اس کے جلسوں میں کبھی اس قدر رقم چندہ کی وصول نہیں ہوئی۔ باثر حضرات نے سفیر موصوف کی کوششوں کا اعتراف کیا۔ معطیوں میں سب سے بڑی رقم جناب خان بہادر احد شاہ صاحب سی آئی ای رئیس جالندھر اور مسٹر احسان الحق صاحب (علیگ) بیرسٹر ایٹ لا کے عطیہ کی تھی۔ خان بہادر صاحب نے ڈیڑھ ہزار روپیہ اور مسٹر احسان الحق صاحب نے پانچسو روپیہ تعمیر کمرہ میں عنایت کیا۔

ہم قوم کے دونوں عنایت فرماؤں کا اُن کی اس فیاضی پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور کارکنان انجمن اسلامیہ سے توقع رکھتے ہیں کہ ان کی توجہ اور سرگرمی سے جالندھر کا ہائی اسکول تھوڑے دنوں میں اپنے کامیاب نتائج کے لحاظ سے پنجاب میں ماڈل اسکول ہوگا اور بزرگان جالندھر سفیر کانفرنس کے مقصد میں پوری توجہ کے ساتھ حصہ لیں گے کیونکہ سفیر کانفرنس کا کام ان کی اور اُن کی اولاد کی خدمت انجام دیتا ہے۔

ضلع سہارن پور حکیم مظفر حسین صاحب سفیر ضلع مذکور میں کام کر رہے ہیں جنہوں نے متعدد قصبات اور دیہات کا دورہ کیا اور ان میں سے (۳) درخواستین اجرا اسلامیہ اسپیشل اسکول کے متعلق اور (۱) امداد مکتب کے متعلق اہالیان دیہات کے ذریعہ سے چیرمین صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ کی خدمتین بھجوائیں۔ خاص سہارنپور میں ایک انجمن اسلامیہ ہے اور انجمن اسلامیہ کی سرپرستی میں ایک مڈل اسکول ہے۔ سہارن پور کا تمام ضلع مسلمان آبادی کے لحاظ سے ممتاز خصوصیت اِس صوبہ میں

رکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ضلع بھر میں تعلیم جدیدہ کے لحاظ سے آج تک وہاں ایک درس گاہ بھی ایسی قایم نہیں ہوسکی جو ضلع کے مسلمانوں کو مغربی علوم و فنون کی قابلیت حاصل کرنے میں مدد دیتی۔ انجمن کے ماتحت ایک مڈل اسکول ہے اور وہ بھی ناکمل حالت میں ہے اور سب سے زیادہ افسوس کے لایق یہ امر ہے کہ کارکنان انجمن اور اسکول اسٹاف میں باہمی کشیدگی ہے۔ یہ حالت ہماری تعلیم سے محرومی اور بدنصیبی کی دلیل ہے امید کہ اہل انجمن و اساتذہ قوم کی بہبودی کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کریں گے اور اس امر پر غور فرمائیں گے کہ ہر ضلع میں برادران وطن کی دوسری قوموں کے کتنی انجمنیں اور کتنی درس گاہیں کیسے اتحاد باہمی کے ساتھ اپنے اپنے اغراض میں مستعدی کے ساتھ کامیاب نظر آتی ہیں۔

بارہ بنکی مولوی محمد حسین صاحب شوق سفیر کانفرنس کی خدمات سکرٹری صاحب انجمن اصلاح المسلمین اودھ کی خواہش پر انجمن مذکور کو تین ماہ کیواسطے تفویض کی گئی ہیں۔ سفیر صاحب موصوف سکرٹری صاحب انجمن کی زیر ہدایت اضلاع اودھ میں کام کر رہے ہیں جو کام اُنھوں نے ضلع بارہ بنکی میں انجام دیے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ضلع کے (۱۲) مواضعات اور قصبات کا دورہ کیا (۹) مقامات سے امداد مکتب اور اجراء مکتب کی درخواستیں چیرمین صاحب ڈسٹرکٹ بورڈ کی خدمت میں بھجوائیں انجمن رفاہ المسلمین ردولی کو ترغیب دی کہ وہ غریب طلبہ کی امداد کتب اور فیس کے ذریعہ سے انجام دے اور اس مقصد کے لئے ایک فنڈ کھولے۔

انجمن تعلیم المسلمین کے واسطے للعہ روپیہ چندہ میں وصول کئے۔

جناب سید مصطفی صاحب ڈپٹی کلکٹر اودھ، جناب خان بہادر عبدالحمید خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر نے سفیر کے مقاصد سے ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

علی الخصوص مسٹر آر، سی ہوبارٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر بارہ بنکی نے سفیر کانفرنس کی زبانی اغراض و مقاصد کانفرنس سے اظہار خوشی و ہمدردی فرمایا صاحب ممدوح کی یہ توجہ نہایت شکرگزاری کے قابل ہے کہ اُنھوں نے جملہ تحصیلداران ضلع کے نام پروانہ جاری فرمایا کہ سفیر کانفرنس کو جس امداد کی ضرورت ہو وہ دی جاوے امید ہے کہ مسٹر ہوبارٹ صاحب کی توجہ اور ہمدردی کی تقلید ہمارے دوسرے سویلین حکام فرمائیں گے اگر تعلیمی مقاصد کی اور تعلیمی کام کرنے والوں کی حکام کی طرف سے رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی جاے گی تو مسلمانوں کی تعلیم میں جو دشواریاں اور رکاوٹیں پیش ہیں وہ بہت جلد دُور ہوجاویں گی لیکن حکام کی توجہ سے پہلے ہر ضلع کے با اثر مسلمانوں کی توجہ کی ضرورت ہے۔

اسوقت ضلع بارہ بنکی میں خدا کے فضل و کرم سے مشاہیر خاندان آباد ہیں بہت سے با اثر صاحب سجّادہ اور مشائخوں کے خاندان کے سربرآوردہ اصحاب موجود ہیں تعلقہ داروں میں آنریبل سر راجہ تصدق رسول خاں بہادر کی ذات گرامی موجود ہَے۔

ان حالات کی موجودگی میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت افسوس ناک پستی کی طرف مائل نظر آتی ہے اور اب تک تمام ضلع میں ڈسٹرکٹ بورڈ اسلامیہ اسکولوں کی تعداد (۸) سے متجاوز نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس ضلع میں مسلمانوں کی اوسط آبادی چالیس ۴۰ فی صدی ہے۔

اسلامی انجمنوں اور درس گاہوں کا معائنہ

دربار بھوپال سے جن اسلامی انجمنوں اور اسلامی مدارس کو امداد دی جاتی ہے علیا حضرت بیگم صاحبہ فرماں روائے بھوپال کی ہدایت ہے کہ ان انجمنوں اور مدارس کا معائنہ کانفرنس کے ذریعہ سے ہوا کرے، چنانچہ دسؔ اپریل کو خاکسار آنریری جائنٹ

سکریٹری کانفرنس نے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کی معیت میں دارالعلوم ندوہ کا معائنہ کیا۔ یہ امر مسرت کے قابل ہے کہ خود دارالعلوم کے پڑھے ہوئے طلبہ مسند تدریس پر متمکن تھے اور طلبہ کو نہایت خوبی کے ساتھ درس دے رہے تھے۔ ان میں وقار کی علامات موجود تھیں، ان کا طرز تعلیم دل آویز تھا۔ جدید نصاب کے مطابق تعلیم اطمینان سے ہو رہی ہے اور سکون و طمانیت کے ساتھ کام ہو رہا ہے درجہ تکمیل کے طلباء سے جو سوالات محققانہ مولوی سید سلیمان صاحب نے کئے اور اون کے جو جوابات طلبا نے دیے وہ اساتذہ و طلبائے دارالعلوم کی تعلیم و تعلم کی بہترین سند تھے۔ البتہ زبان انگریزی کی تعلیم کی طرف اراکین دارالعلوم کو توجہ کی ضرورت ہے ندوہ کے حساب کی تنقیح مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے بدوران قیام لکھنؤ کی۔ ان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حسابات نہایت باقاعدہ ہیں جو جناب نواب علی حسن صاحب بہادر اور مولوی نظام الدین حسن صاحب کی توجہ کا نتیجہ ہے

دوسرا معائنہ انجمن ہدایت الاسلام دہلی کا مولوی محمود احمد صاحب عباسی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ دفتر کانفرنس نے یکم و دوسری اپریل کو کیا۔

یہ انجمن ۱۹۰۶ء سے قائم ہے جس کی روح رواں حاجی محمد اسحٰق صاحب تاجر صدر بازار دہلی ہیں۔ حاجی صاحب موصوف کو انجمن کے کاموں اور اس کے مقاصد سے گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے۔

انجمن کے اہم مقاصد میں ایک تو اشاعت اسلام کا کام ہے دوسرے دیہات کے مسلمانوں میں ارکان اسلام کی تعلیم وعظ و پند کے ذریعہ سے کرنی مقصود ہے جس کے واسطے اس وقت (۵) واعظ مامور ہیں۔

اس کے علاوہ دیہات میں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے مکاتب و مدارس بھی واعظوں کے ذریعہ سے انجمن قایم کرتی ہے۔ موجودہ مکتبوں کی تعداد (۱۴) ہے جو ضلع گورگانوہ، حصار، متھرا کے دیہات میں واقع ہیں۔ ان مکتبوں میں انجمن حمایت

الاسلام لاہور کے رسالے پڑھائے جاتے ہیں۔ زیر تعلیم لڑکوں کی تعداد (۳۸۵) اور زیر تعلیم لڑکیوں کی تعداد (۵۰) ہے۔ خرچ [illegible] روپیہ سالانہ ہے۔

پہلے انجمن کی طرف سے "الہدایت" ایک ماہوار پھر ہفتہ وار رسالہ بھی شائع ہوتا تھا جو اب بند ہے لیکن رسالہ کے جاری کرنے کا ارا کین انجمن کو پھر خیال پیدا ہوا ہی۔ اس رسالہ میں اسلام کی خوبیاں اور برکات کا ذکر ہوتا تھا اور معترضین اسلام کے اعتراضوں کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں مولوی عبدالحق صاحب حقانی کی کتاب "البیان" کا ترجمہ بزبان انگریزی حاجی محمد اسحٰق صاحب نے اپنی ذات سے صرف کثیر برداشت کر کے چھپوایا اور شائع کیا۔

سنہ ۱۳۳۵ ہجری میں انجمن کی کل آمدنی [illegible] ۶/۷ پائی ہوئی اس کے مقابلہ میں خرچ کی میزان [illegible] ہے۔ آخر جمادی الاول سنہ ۱۳۳۶ھ میں خزانہ انجمن میں صرف [illegible] ۱۰/۶ پائی موجود تھے۔ مستقل آمدنی [illegible] سالانہ ہے جو سرکار بھوپال سے عطا ہوتی ہے باقی روپیہ دیگر عطیوں اور واعظوں کے ذریعہ سے بطور چندہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔

انجمن کے مقاصد مفید اور کارآمد ہیں۔ عملی حیثیت سے بھی انجمن نے مفید قوم کام انجام دیئے ہیں اور حاجی صاحب موصوف کی کوشش و ہمدردی اس قابل ہے کہ مخصوص بزرگان دہلی انجمن کی مدد فرمائیں۔ جو کام اس وقت ہو رہا ہے اوس میں زیادہ سرگرمی اور توجہ سے کام کیا جائے اور جو امور قابل اصلاح ہیں اُن کی اصلاح کی جائے تاکہ جن مقاصد کے ساتھ یہ نیک کام شروع کیا گیا ہے اوس میں ترقی ہو۔ معائنہ کی پوری کیفیت اور اصلاحی امور کی طرف ارا کین انجمن کو توجہ دلائی گئی ہے۔ خدا سے اُمید ہے کہ سال آئندہ کی رپورٹ زیادہ تسکین بخش ہوگی اور مفید کاموں کی انجام دہی سے معمور نظر آئیگی۔

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم اور گورنمنٹ

فروری سنہ ۱۹۱۳ میں گورنمنٹ ہند نے مختلف صوبجات کی مقامی حکومتوں کو بذریعہ

ایک خاص سرکلر کے اس امر کی جانب توجہ دلائی تھی کہ اپنے اپنے صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے بارہ میں تجاویز قرار دیں۔ چنانچہ تقریباً تمام صوبجات میں مقامی حکومتوں کی طرف سے خاص اس مقصد کے لئے کمیٹیاں بنیں اور اس مسئلہ کے کل پہلوؤں پر غور ہوکر اور مقامی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے اوس صوبہ کے مسلمانوں کی پرائمری سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے رپورٹیں مرتب ہوئیں اور جو تجاویز ترقی تعلیم کے باب میں قرار دی گئی تھیں گورنمنٹ نے اون پر توجہ مبذول فرماکر ضروری تجاویز پر عملی ذرائع اختیار کئے جانے کی تدبیریں قرار دیں۔ غرضکہ جہاں تک غور اور بحث تجاویز اور تدابیر اور اسکیموں کا تعلق ہے کوئی شبہ نہیں کہ اس کام کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا گیا اور بعض صوبوں میں مجوزہ اسکیموں کی متابعت میں کچھ نہ کچھ عملی کام کا آغاز ہوا۔ لیکن جب ہم اس مسئلہ پر اس پہلو سے نظر ڈالتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس تمام جد وجہد کا نتیجہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے بارہ میں تین چار سال کی مدت گذر جانے کے بعد کیا مترتب ہوا تو ہم کو مایوسی ہوتی ہے۔ مثال کے طور سے ہم اپنے صوبہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کو پیش کرتے ہیں۔ اس صوبہ کی لوکل گورنمنٹ نے بذریعہ رزولیوشن مجریہ ۲۵ اگست ۱۹۱۴ء منجملہ اور تدابیر متعلقہ ترقی تعلیم مسلمانان ابتدائی تعلیم کی توسیع کی غرض سے یہ قرار دیا کہ جس کسی مقام پر بیس طالب علموں تک کی حاضری کی اوس مقام کے مسلمان ذمہ داری کریں ڈسٹرکٹ بورڈ کا فرض ہوگا کہ اپنے صرف سے اسپیشل اسلامیہ اسکول جاری کرے، اور مسلمان اوستاد مقرر کرے اسپیشل اسلامیہ اسکولوں کے علاوہ دیسی مکاتب کی اصلاح اور امداد کے لئے علاوہ پراونشل مکتب کمیٹی کے ضلع وار مکتب کمیٹیاں قایم ہوئیں اور دینی اور دنیوی تعلیم کا نصاب مقرر کرنے کی غرض سے ایک اسپیشل مکتب ٹیکسٹ بک کمیٹی کا اجرا عمل میں آیا اور اس تمام کام کی نگرانی اور اس اسکیم کی کامیابی کے لئے ایک اسپیشل انسپکٹر اور

چند اسپیشل ڈپٹی انسپکٹروں کا تقرر کیا گیا۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن جب ہم نتائج پر نظر کرتے ہیں جو گذشتہ دو سالوں کی اس تمام جد و جہد سے برآمد ہوئے اور جن کا اظہار اسپیشل محمدن انسپکٹر کی سالانہ رپورٹ کے علاوہ آنریبل مسٹر ڈیلا فوس صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے صوبجات ہذا کی تعلیمی کونسل کے اجلاس منعقدہ ۱۴ مارچ ۱۹۱۶ء میں آنریبل مسٹر سید آل نبی صاحب کے پیش کردہ رزولیوشن متعلق توسیع و امداد مکاتب کے جواب میں بیان فرمایا تھا کہ (۶۴) جدید اسلامیہ اسکول جاری ہوئے اور (۹۰) مکاتب کو گرانٹ دی گئی۔ لیکن دوسری طرف ہم اسپیشل انسپکٹر کی رپورٹ میں یہ دیکھتے ہیں کہ سال زیر بحث میں (۱۰۰) غیر امدادی مکاتب بند ہو گئے تو افسوس کے ساتھ یہ نتیجہ نکالنے کو مجبور ہیں کہ جہاں تک مسلمانوں میں ابتدائی تعلیم کی توسیع کا تعلق ہے اس مدت میں اس تمام کوشش، جد و جہد اور مصارف کے مقابلہ میں کوئی ایسی نفع بخش اور نتیجہ خیز کارروائی نہیں ہوئی جس پر ہم مطمئن ہو سکیں۔

جہاں تک ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے اور جو حالات وقتاً فوقتاً ہمیں معلوم ہوئے ہیں، اُن کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا سبب وہ غیر ہمدردانہ طرز عمل ہے جو اکثر ڈسٹرکٹ بورڈوں نے کافی رقم اپنے بجٹوں میں اجرائے اسکول اور امداد مکاتب کے لئے نہ رکھنے سے اختیار کیا ہے۔ ہمیں ذاتی علم ہے کہ اجرائے اسکول اور مکتبوں کی امداد کے متعلق درخواستوں کی کثیر تعداد بہت خفیف اور غیر واقعی عذرات اور عدم گنجائش فنڈ کی بنا پر خارج کی گئی ہیں۔ ہمیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ دوران جنگ میں گورنمنٹ زیادہ رقوم توسیع تعلیم کے بارہ میں عطا کرنے سے قاصر ہے لیکن اسی کے ساتھ ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ گورنمنٹ کے پاس اس کام کے لئے اتنی رقم موجود نہیں کہ مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی ضروریات کو جائز حد تک پورا کر سکے خود صاحب ڈائرکٹر بہادر نے فرمایا ہے کہ ساڑھے چار لاکھ روپیہ کی جدید گرانٹ گورنمنٹ ہند

کی جانب سے پرائمری تعلیم کے لئے اس صوبہ کی گورنمنٹ کے پاس موجود ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سال اسپیشل اسکولوں اور مکاتب کی امداد کے لئے جیسا کہ ۹ اپریل کے اجلاس میں آنریبل نواب عبدالمجید صاحب سی۔ آئی۔ ای کی تحریک پر یقین دلایا گیا ہے کافی رقم مہیا کی جائے گی۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو روپیہ نہ ہونے کا عذر کرنے کا موقع نہیں دیا جائیگا۔

ایک اور دقت اور مشکل اس بارہ میں یہ درپیش ہے کہ اسپیشل اسلامیہ اسکولوں کے لئے مسلمان مدرسین کی کافی تعداد دستیاب نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جس نسبت سے اسپیشل اسلامیہ اسکول جاری ہوتے جاتے ہیں اوسی نسبت سے ڈسٹرکٹ بورڈ کے عام مدارس میں جو تھوڑے بہت مسلمان مدرسین موجود ہیں اون کو وہاں سے ہٹا ہٹا کر اسلامیہ ہائی اسکولوں میں لایا جاتا ہے۔ اس حالت کا اعتراف خود ڈائرکٹر صاحب نے اپنی تقریر محولہ بالا میں کیا ہے۔ ظاہر کہ اس کارروائی سے ایک طرف اگر مسلمانوں کا فائدہ ہے تو دوسری جانب نقصان ہے۔ اس حالت کو مدنظر رکھ کر ڈائرکٹر صاحب نے تو مہربانی سے یہ مشورہ دیا ہے کہ اسپیشل اسکولوں کے اجراء پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ مسلمان مدرسین کے کافی تعداد بہم پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ مگر یہ تو وہی مثل ہوئی کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ اس بارہ میں ہمکو اپنے لایق دوست آنریبل مسٹر سید رضا علی سے اتفاق رائے ہے کہ اگر قدیم طرز کے معلموں اور مولویوں سے ان مکاتب اور مدارس کی معلمی کا کام لیا جائے تو مسلمان مدرسین کی قلت کا سوال آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم عرض کریں گے کہ مسلمان مدرسین کی کافی تعداد بہم پہونچانے کی ذمہ داری گورنمنٹ پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ڈویزن میں اسپیشل نارمل اسکولوں کا قائم ہونا ازبس ضروری ہے یقین ہے کہ جناب لفٹننٹ گورنر بہادر نے نارمل اسکول کے جاری کئے جانے کے متعلق

کونسل کے گذشتہ اجلاس میں جو تذکرہ فرمایا تھا وہ جلد عملی صورت اختیار کرے گا۔

محولہ بالا گورنمنٹ رزولیوشن مجریہ ۲۵ اگست ۱۹۱۴ء کی تعمیل میں فیض آباد ڈسٹرکٹ بورڈ نے ایک مکتب کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کے سکرٹری مولوی محمد فائق صاحب بی اے۔ ایل ایل بی۔ وکیل فیض آباد ہیں۔ جنھوں نے اپنی مہربانی سے ۱۹۱۷ء کی سالانہ رپورٹ مکتب کمیٹی دفتر کانفرنس میں ارسال فرمائی ہے۔

رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خواہش کے ساتھ رزولیوشن مجریہ ۲۵ اگست کی تعمیل کمیٹی کو کرنی چاہتی تھی۔ اس میں ایسی رکاوٹیں ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے پیش آئیں جن کی وجہ سے تعلیم کی اس قدر توسیع نہ ہوسکی جو رزولیوشن مذکور کا اصلی مقصد تھا۔

۱۹۱۶ء میں مکتب کمیٹی کی سفارش سے صرف (۸) مکاتب کو امداد دی گئی۔ جن کو اکہتر روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔

۱۹۱۷ء کے بجٹ کے متعلق کوئی تخمینہ مکتب کمیٹی سے نہیں طلب کیا گیا اور جو رقم مبلغ پانچسو روپیہ کی پچھلے سال کے چند مہینوں کے واسطے حسب خواہش مکتب کمیٹی درج ہوئی تھی وہ پورے سال کے واسطے بجٹ میں رکھی گئی اور باوصف اس امر کے کہ مکتب کمیٹی نے نہایت معقول وجوہات کی بناپر پانچسو روپیہ کی رقم کو ناکافی ثابت کیا کوئی توجہ ڈسٹرکٹ بورڈ نے نہیں کی، نہ فقط یہ کیا بلکہ دوبارہ سہ بارہ توجہ دلانے پر بالآخر یہ قطعی فیصلہ کردیا کہ بجٹ میں امداد مکاتب کی مد میں اضافہ نہیں کیا جاویگا۔

جب یہ حالت پیش آئی تو لامحالہ اس کا یہ نتیجہ ہونا تھا کہ بہت سی درخواستیں نامنظور کی جاویں۔ رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امداد کی ایسی ایسی درخواستیں مسترد ہوتی رہی ہیں جن کی نہایت زوردار الفاظ میں ڈپٹی انسپکٹر صاحب ضلع و ڈپٹی انسپکٹر

صاحب اسلامیہ مدارس و سکریٹری صاحب مکتب کمیٹی نے سفارش کی تھی۔

قصبہ اجودھیا کے مسلمانوں نے جن کی حالت بہت سقیم ہے کوشش کے بعد مکتب قائم کیا۔ طالب امداد ہوئے لیکن ان کو مدد نہ مل سکی۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب ضلع سے مکتب کمیٹی کا سکریٹری دریافت کرتا ہے کہ وہ ضلع کے مکاتب کی فہرست مرتب فرما دیں لیکن گزارش اور یاددہانیوں کے باوجود بھی فہرست نہیں دی جاتی۔

باوجود ان تمام رکاوٹوں کے جو مکتب قائم ہوئے ڈویژنل انسپکٹر صاحب مدارس نے اپنے معائنہ میں ان کے کام سے اظہار پسندیدگی فرمایا اور ان مدرسوں کو سب سے زیادہ مستحق امداد قرار دیا

جن دقتوں اور دشواریوں کے اندر مکتب کمیٹی فیض آباد نے کام کیا ہے وہ بہت کچھ شکر گزاری کے قابل ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان مشکلات کا حل کیونکر ہو۔

ایک حق یا موقع گورنمنٹ ہماری مسلسل خواہشوں کے اظہار کے بعد ہم کو دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہم اس سے فائدہ نہیں اوٹھا سکتے کیونکہ ہمارے گلے کی رسی کا ڈورہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہاتھ میں ہے اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے بیشتر ممبروں کو اس مقصد سے دلچسپی اور ہمدردی نہیں

اس قسم کے واقعات ہر مقام پر پیش آئے ہیں بیسیوں درخواستیں مسترد کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینکدی گئی ہیں۔ بجٹ میں سب سے کم جس مد میں رقم رکھی جاتی ہے وہ صیغہ تعلیم ہے۔ حالت تو یہ ہے کہ ہر جگہ مسلمان آمادہ ہو کر مکتب کھولتے ہیں، امداد کی درخواستیں کرتے ہیں یہی نہیں کہ امداد نہیں دی جاتی (بجٹ میں کافی رقم نہیں رکھی جاتی) طرح طرح کی مشکلات حائل کی جاتی ہیں۔ جب اس طرح سے چندے اسکولوں کی تعداد میں کمی ہوگی تو ہم سے کہا جائے گا کہ گورنمنٹ نے تو سب کچھ کیا لیکن مسلمان خود پڑھنا نہیں چاہتے اور ان کو اس طرف توجہ نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلہ امداد کو صاف کیا جائے اور غور کیا جائے کہ وہ کون سی تدبیر اختیار کی جاوے جس کے سبب سے

یہ شکل آسان ہو - امید ہے کہ دوسرے ضلاع کی کمتب کمیٹیوں کے چیرمین یا ممبر صاحبان اپنے یہاں کے حالات سے ہمکو اطلاع دیں گے -

محکمہ تعلیم اور مسلمان

ذیل میں ہم چند اعداد الہ آباد یونیورسٹی کے امتحان ایل ٹی اور ٹیچرز سارٹیفکٹ کے نتائج کے اس غرض سے درج کرتے ہیں کہ ہماری قوم کے بزرگ غور فرمائیں کہ باوجود اون دل خوش کن امیدوں اور توقعات کے جو مسلمانوں کی ترقی کے باب میں باندھی جاتی ہیں، ہم ذرائع ترقی سے روز بروز کس قدر دور ہوتے جاتے ہیں -

الہ آباد ٹرینینگ کالج سے حسب ذیل طلبہ کامیاب ہوئے -

نام ڈویزن	ہندو	مسلمان	عیسائی	کل
اوّل ڈویزن	۴	۱	۵	۱۰
سکنڈ ڈویزن	۲۳	۴	۲	۲۹
تھرڈ ڈویزن	۶	۲	۱	۹
صرف سائنس میں	۱	۰	۰	۱
کل	۳۴	۷	۸	۴۹

علاوہ ازین ٹیچرز سارٹیفکٹ میں حسب ذیل طلبہ الہ آباد ٹرینینگ کالج کی کامیاب ہوئے -

نام ڈویزن	ہندو	مسلمان	عیسائی	کل
سکنڈ ڈویژن	۴	۰	۰	۴
تھرڈ ڈویزن	۲	۰	۰	۲
کل	۶	۰	۰	۶

اس طرح ایل ٹی اور ٹیچرز سارٹیفکٹ کے امتحان میں الہ آباد ٹریننگ کالج سے (۴۰) ہندو (۷) مسلمان (۸) عیسائی کامیاب ہوئے۔

علاوہ ازیں جبل پور ٹریننگ کالج سے ایل ٹی کے امتحان میں حسب ذیل طلبہ کامیاب ہوئے۔

نام ڈویزن	ہندو	مسلمان	عیسائی	کل
اوّل ڈویزن	۱	۰	۰	۱
دوم ڈویزن	۲۳	۲	۰	۲۵
سوم ڈویزن	۱۴	۰	۰	۱۴
کل	۳۸	۲	۰	۴۰

جبل پور ٹریننگ کالج سے ٹیچرز سارٹیفکٹ کے امتحان میں حسب ذیل طلبہ کامیاب ہوئے۔

نام ڈویزن	ہندو	مسلمان	عیسائی	کل
سکنڈ ڈویزن	۸	۰	۰	۸
تھرڈ ڈویزن	۵	۰	۰	۵
کل	۱۳	۰	۰	۱۳

ایک عرصہ سے کانفرنس کی جانب سے یہ کوشش جاری ہے کہ مختلف صوبجات کے ٹریننگ کالجوں اور نارمل اسکولوں میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔بیس بیس ماہوار کے وظائف خاص اسی غرض سے کانفرنس نے اپنے فنڈ سے دینے منظور کئے چنانچہ وظائف دیے گئے۔صوبہ پنجاب، ممالک متحدہ اور ممالک متوسط میں توکچھ مسلمان ٹریننگ کالجوں میں کانفرنس کے وظائف لیکر داخل ہوے۔چند سال ہوے کہ ڈائرکٹر بہادر سررشتہ تعلیم بنگال کے پاس کانفرنس نے وظائف کے لیے یکمشت رقم بھیجی تھی

مگر ایک سال کے بعد یہ رقم وہاں سے اس اطلاع کے ساتھ واپس آئی کہ کسی مسلمان نے وظائف لینے اور محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اب چند سال سے یہ کوشش ہے کہ عام تعلیم کے لئے ایف اے اور بی اے کلاسوں میں غیر مستطیع طلبہ کو جو وظائف دیے جائیں وہ اس شرط کے ساتھ دیے جائیں کہ بعد فراغت تعلیم یہ طلبہ سررشتہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرنے کا معاہدہ کریں۔ اس مرتبہ بھی خاص وظائف کا انتظام ہے اور کانفرنس کی جانب سے چند مسلمان امیدواروں کے داخلہ ٹرننگ کالج کے لئے سررشتہ سے کوشش کی گئی ہے لیکن یہ سب تدبیریں وقتی اور عارضی ہیں۔ ہمکو موقر معاصر "البشیر" سے اس بارہ میں اتفاق رائے ہے کہ علی گڈھ میں ٹیچرز ٹریننگ کلاس جلد سے جلد جاری کرنے کی کوشش کی جائے ہمیں امید ہے کہ اس بارہ میں بزرگان قوم اپنے خیالات اور اپنے مفید تجاویز اور مشوروں سے مطلع فرمائیں گے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور نے اپنے کالج میں جونیر ٹریننگ کلاس جاری کرکے ایک مفید اور ضروری کام کا آغاز کیا ہے جو یقیناً مسلمانان پنجاب کے تعلیمی ترقی کے لئے عمدہ نتائج کا موجب ہوگا۔

غیر مستطیع مسلمان طلبہ کے وظائف کی ایک سبیل

اس وقت کانفرنس میں دو قسم کی آمدنی ہوتی ہے یعنی بعض اسلامی ریاستوں سے مستقل سالانہ گرانٹ، دوسرے کانفرنس کی سالانہ ممبری کی فیس جو زیادہ تر سفیران کانفرنس کی معرفت وصول ہوئی۔

فیس ممبری کے روپیہ میں سے ایک معقول حصہ ہر سال قابل اور ضرورت مند طلبہ کی اعانت میں بطور وظیفہ کے دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے وظائف سیکڑوں طلبہ کو کانفرنس نے اب تک دیے ہیں اور بیسیوں

شریف طلبہ نے مختلف علوم کی شاخوں میں ڈگریاں حاصل کی ہیں اور عزت وکامیابی کے ساتھ اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، جن کو وظائف سے اگر مدد نہ ملتی تو اُن کی زندگی غالباً مشکل سے کامیاب ہو سکتی تھی لیکن جو امداد اس وقت تک دی گئی یا دی جاتی رہی ہے وہ اس مانگ کے مقابلہ میں بہت کم ہے جس کی ضرورت ہے۔ قوم کا متوسط طبقہ تعلیم پاتا ہے اور تعلیم کی گرانی اس امر کی محتاج ہے کہ اغنیائے قوم کا حصہ اس میں فیاضی کے ساتھ مدد دے۔ اس مدد کا یہ طریقہ مناسب ہوگا کہ ایک تیسری مد آمدنی کی دفتر کانفرنس میں کھول جائے یعنی یہ کہ کانفرنس کی لائف ممبری کثرت کے ساتھ بزرگان قوم و حامیان تعلیم قبول فرمائیں۔ گو لائف ممبری کا قاعدہ پہلے سے موجود ہے اور بعض بعض اصحاب بہت زمانہ سے لائف ممبر ہوئے بھی ہیں، لیکن اُن کی تعداد برائے نام ہے۔ اب اس سلسلہ کو وسیع کرنا مقصود ہے اور اس گذارش سے یہ غرض ہے کہ قوم کے وہ اکابر جو تعلیم کے حامی ہیں اس طرف خاص طور پر توجہ فرمائیں۔ لائف ممبری کی فیس ایک سو پچیس روپیہ ہے جو یک مشت ایک مرتبہ ادا کی جاتی ہے اگر اس وسیع ملک سے اور ہماری قوم کی کثیر تعداد سے ایک ہزار لائف ممبر بھی مل گئے تو ان کے ذریعہ سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ کا سرمایہ جمع ہو جاوے گا اور اس سرمایہ کو محفوظ رکھ کر پانچ ہزار روپیہ سالانہ کی مستقل آمدنی ہمیشہ کے لئے قائم رہ سکیگی اور یہ آمدنی اشاعت تعلیم کے مقصد میں اور غیر مستطیع طلبہ کی امداد میں اُن کی ذہنی اور دماغی قابلیتوں کا لحاظ کر کے صرف کی جاوے گی۔

اس خیال کی تحریک شروع کر دی گئی ہے۔ جن فیاض بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں نے میری درخواست پر توجہ فرما کر لائف ممبری قبول فرمائی اور زرفیس مبلغ ایک سو پچیس روپیہ دفتر کانفرنس کو عنایت فرمایا، دلی احسانمندی اور شکرگزاری کے ساتھ ان کے نام نامی شایع کرتا ہوں۔

(۱) عالی جناب محمد اکبر نذر علی حیدری صاحب ہوم سکریٹری سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن ماھ ۵
(۲) عالی جناب سید راس مسعود صاحب بی اے ناظم تعلیمات " " ماھ ۵
(۳) عالی جناب حسن لطیف صاحب ڈویزنل انجنیر " " ماھ ۵
(۴) عالی جناب مولوی کرامت اللہ خاں صاحب ناظم تعمیرات " " ماھ ۵
(۵) عالی جناب نواب بہادر عبدالصمد خاں صاحب رئیس طالب نگر ضلع علی گڈھ ماھ ۵
(۶) عالی جناب نواب احمد سعید خانصاحب رئیس چھتاری ضلع بلند شہر ماھ ۵
(۷) عالی جناب راجہ اصغر علی خاں صاحب رئیس پنڈراول ضلع علی گڈھ ماھ ۵
(۸) عالی جناب کنور محمد عبدالجلیل خاں صاحب رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر ماھ ۵
(۹) برخوردار محمد عابد خاں صاحب رئیس بھیکم پور ماھ ۵
(۱۰) خاکسار آنریری جائنٹ سکرٹری ماھ ۵

آیندہ جو اصحاب لائف ممبری قبول فرما کر فیس ارسال فرمائیں گے اُن کے نام نامی کانفرنس گزٹ میں شائع ہوتے رہیں گے۔ موجودہ طریقہ امداد سے بڑا نتیجہ یہ حاصل ہوگا کہ مستقل طور پر پائدار بنیاد پر اشاعت تعلیم کا کام جاری رہے گا اور بزرگان قوم کی یہ امداد ہمیشہ خیر جاریہ کے طور پر قایم رہے گی وما توفیقی الا باللہ۔

ایک مفید تجویز

ذیل میں ہم جناب نواب حاجی محمد اسمعیل خاں صاحب ایڈیٹر افادہ کا مراسلہ درج کرتے ہیں جس میں نواب صاحب موصوف نے منشی فاضل، مولوی فاضل اور ملا کے سندیافتوں کو مختلف محکمہ جات میں ملازمت کے حقوق ملنے کے متعلق ایک مفید تجویز پیش کی ہے۔ امید ہے کہ اس تجویز کے متعلق دیگر باخبر حضرات اظہار رائے کریں گے تاکہ آیندہ اجلاس کانفرنس میں غور کر کے یہ مسئلہ گورنمنٹ کی توجہ کی غرض سے پیش کیا جائے۔ (ایڈیٹر)

جناب والا

میں یہ عریضہ کانفرنس گزٹ میں چھاپنے کے واسطے پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ہندوستان میں عربی و فارسی کی ترقی کے واسطے منجانب آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس گورنمنٹ سے یہ درخواست کرنا چاہیئے کہ پنجاب کے (منشی فاضل) اور اسی صوبہ کے (ملاّ) کی سند والوں کو یہ حقوق عطا ہوں کہ

(الف) وہ ہر محکمہ کی کلرکی میں جس میں انگریزی کی ضرورت نہ ہوتی ہو ملازم ہو سکیں۔

(ب) اسی صوبہ کے (ملاّ) کی سند والے اور پنجاب کے مولوی فاضل ضلع کی مالی اور فوجداری اور دیوانی کی منصفی کی عدالتوں کے واسطے ضروری قوانین میں بزبان اُردو امتحان دے سکیں۔

چونکہ یہ درخواست ہر طرح معقول ہے اس واسطے بلاشبہ کامیابی کی اُمید ہے۔

کانفرنس گزٹ میں چھاپنے کی ضرورت اس خط کی یہ ہے کہ عام رائے معلوم ہو جائے اور نیز ایسی خط و کتابتیں چھاپنے سے کانفرنس گزٹ ہر دلعزیزی حاصل کر سکے گا۔ کیونکہ یہ مسائل کانفرنس کے اصلی مسائل ہیں۔

جناب کا خادم

حاجی محمد اسمٰعیل خاں۔ ایڈیٹر افادہ۔ از علی گڈھ

۱۳ مئی سنہ ۱۹۱۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کانفرنس گزٹ

حصّہ دویم

۱۔ اسلامی تعلیم گاہوں کی عام حالت، اُن کے انتظامی نقائص اور اصلاح کی تدابیر	مسٹر ذاکر حسین خاں متعلم بی اے کلاس محمدن کالج علی گڈھ
فن تعلیم و تدریس کی گذشتہ تاریخ	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم اے ڈاکٹر ایس سی، پی ایچ ڈی، سی آئی ای

اسلامی تعلیم گاہوں کی عام حالت اُن کے انتظامی نقائص اور اصلاح کی تدابیر

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

ہائی اسکولوں کے قیام کی تدبیر گزشتہ بالا بیان سے یہ مسئلہ غالباً کافی طور سے حل ہوگیا کہ ابتدائی مکاتب اور وسطی مدارس کے لئے سرمایہ کے گتھی آسانی سے سلجھ سکتی ہے۔ رہا ہائی اسکولوں کے لئے سرمایہ کا سوال اس کے متعلق ہمیں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس زمانہ میں اسکولوں کا چلا لینا کوئی زیادہ سرمایہ طلب کام نہیں ہے۔ طلبا کے ہجوم۔ تعلیم کی گرانی۔ معلمین کی ارزانی اور یونیورسٹی کی سختیوں نے بعض حصص ملک میں اسکولوں کے قیام کو ایک طرح کی زرخیز تجارت بنا دیا ہے ہم مانتے ہیں کہ ابھی مسلمانوں میں تعلیم کی اس قدر کثرت نہیں ہوئی ہے کہ محض فیس اور سرکاری اعانت پر اسکول قایم کئے جائیں کیونکہ مسلمان مدرسین کا قلیل تنخواہوں پر میسر آنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم یہ بہت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک مرتبہ کوشش

کرکے اتنی رقم یکشت مہیا کرلی جائے کہ ایک اسکول کی عمارت بن جائے۔ رہا قیام کے بعد اجراء کے مصارف وہ بہت کچھ توفیس اور اعانت سرکاری سے پورے ہوسکتے ہیں[۱] اور مابقی کے لئے مقامی طور پر کافی ماہانہ چندے وصول ہوسکتے ہیں۔ الہ آباد، لکھنؤ، بریلی، شاہجہان پور، ہردوئی، بدایوں[۲]، جون پور، گورکھپور۔ بنارس وغیرہ مقامات میں مسلمانوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مقام پر ایک ایک اسکول بآسانی چل سکتا ہے اور بحالات موجودہ صرف ابتدائی مکاتیب اور ہائی اسکولوں کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ہے۔ مکاتیب تو اس لئے ضروری ہیں کہ معمولی نوشت و خواند، حساب، جغرافیہ اور مسائل مذہبی کی تعلیم تو ہر مسلمان بچے کے لئے منجملہ فرائض کے ہے۔

عام تعلیم کی اہمیت

آگے چلکر اگر طبیعت مناسب ہو اور حالات مساعد ہوں تو میلان طبع کے موافق زندگی میں ترقی کرنے کے لئے ہزاروں راہیں کھلی ہیں، تجارت، فلاحت، صنعت، غرض

---

[۱] مثال کے طور پر ہم اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کو پیش کرسکتے ہیں۔ اس اسکول کا کل خرچ تقریباً للعہ روپیہ ماہوار ہے جو محض فیس تعلیم اور کرایہ دارالاقامہ سے پورا ہوجاتا ہے۔ صرف کم و بیش للعہ ماہوار کی کمی ہوتی ہے جو چندوں سے پوری ہوجاتی ہے۔ اس میں کل للعہ روپیہ ماہوار مستقل چندہ ہے لطف یہ ہے کہ اٹاوہ اسکول گورنمنٹ ایڈ بھی نہیں لیتا۔ اب اسی کے مقابلہ پر ہریشچندر ہائی اسکول بنارس کو لیجئے۔ اس میں ایک حبہ بھی مستقل چندہ کا نہیں آتا۔ للعہ روپیہ ماہوار خرچ ہے اور ایک ہزار سے زائد کی آمدنی کیونکہ للعہ روپیہ ماہوار کی رقم مدرسین جو کل کے کل ہندو ہیں اپنی طرف سے بطور چندہ دیتے ہیں یہ رقم اضافہ عمارات میں صرف ہوتی ہے۔

[۲] لکھنؤ اور بدایوں میں اسلامی مدارس کھلے ہیں گر جب کچھ دنوں تک باستقلال قایم رہ سکیں تو البتہ فخر کیا جاسکتا ہے۔ بدایوں میں تو ابھی سے اختلافات شروع ہیں۔ آگے خدا خیر کرے۔

جس طرف زمانہ کے رو لے جائیگی تعلیم کا فیض کارآمد ثابت ہوگا۔ بعض ان میں سے علوم عربیہ کی تکمیل کرکے روشن خیال مصنف اور مقتدائے مذہب بن سکیں گے اور بعض صنعت وحرفت یا تجارت کی طرف مائل ہوں گے یا نہیں تو انگریزی اسکولوں کے آٹھویں نویں جماعت میں داخل ہوکر اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کریں گے غرضکہ قوم کا مستقبل محض نشر تعلیم پر منحصر ہے۔ کیونکہ صرف چند افراد کی اعلیٰ علمی ترقی سے اس وقت تک کوئی معتدبہ فائدہ ممکن نہیں جب تک تعلیم عام نہ ہو جائے۔ قوم کی سطح صرف اُس وقت بلند ہوسکتی ہے جبکہ طبقہ عوام جن پر قوم کا ۹۵ فی صدی حصہ مشتمل ہے ترقی کرلے ورنہ وہ ایک بلند مرتبہ افراد کی مثالوں سے قوم کو من حیث القوم وجہہ تفاخر کے ماسوا کوئی مادی یا محسوس نفع نہیں۔ رہے ہائی اسکول اُن کی اس لئے ضرورت ہے کہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو اور آگے بڑھنا چاہتے ہوں اون کو آسانی سے اپنے ضلع میں رہکر میٹرکیولیشن پاس کرلینے کا موقع ہو تعلیم کا یہ زمانہ سب سے زیادہ اہم اور خطرناک ہے اگر آدمی اس دلدل کو عبور کرگیا تو آگے کالج کی تعلیم صرف سرمایہ کا سوال بن جاتی ہے۔ علاوہ بریں سرکاری مدارس میں چونکہ طلبا کی کافی گنجایش نہیں ہے اس لئے اُن کا قیام اور بھی اہم ہے پھر اس کے بعد گورنمنٹ کالجوں میں آسانی سے داخلہ ہوسکتا ہے جہاں مسلمان طلبا کی تعداد عموماً بہت کم ہوتی ہے اور جہاں یونیورسٹی کی طرف سے کوئی محدود تعداد لازمی نہیں ہے ہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف کی ضرورت البتہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ قومی کالجوں میں بھی طلبا کو کافی وظائف دیئے جاتے ہیں۔

قومی کالجوں کا افسوسناک اسراف

لیکن چونکہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے قومی کالجوں کی اُفتادہی غلط پڑی ہے جہاں مسرفانہ زندگی اور ظاہری آرایش ونمود کو روشن دماغی اور تہذیب کا مرادف سمجھا جاتا

ہے لہذا جو رقم بطور وظیفہ کے کسی طالب علم کو دی بھی جاتی ہے وہ اُس کی مصارف کا ایک نہایت قلیل جزو ہوتی ہے اور بیچارے والدین اور سرپرستوں پر غالبًا اتنا ہی بار پڑتا ہے جتنا کسی دوسرے سرکاری یا مشن کالج میں تعلیم دلانے کی صورت میں ہوتا۔ کاشکے یہی وظایف دوسرے کالجوں کے طلبا کو دیے جاتے۔

قیام مدارس کے راستہ میں دوسری دقت

سرمایہ کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور ہماری ذاتی راے یہ ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم کہہ آئے ہیں کہ ابتدائی مدارس و مکاتب اور ہائی اسکولوں کے لئے خود ہر جگہہ مقامی طور پر کافی چندہ ہو سکتا ہے ہاں کالجوں کے قیام کے لئے البتہ والیان ملک اور اُمراے قوم کو توجہ دلانے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن سردست ابتدائی مکتبوں ہائی اسکولوں اور صنعتی مدرسوں کا اجرا کالجوں کے قیام سے زیادہ اہم ہے لیکن یہاں یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جب قیام مدارس کے لئے ہر جگہہ کافی سرمایہ مہیا ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ملک میں قومی مدارس کی تعداد اِس قدر کم ہے۔

مسلمانوں میں قابلیت انتظام کا فقدان

اِس سوال کا جواب واقعات کی زبان حال سے مل سکتا ہے مسلمانوں میں نظم ونسق کی قوت ایسی افسوسناک طور پر فنا ہو گئی ہے کہ باوجود کافی سرمایہ کی ایک معمولی سا کام اُن کی چلائے نہیں چلتا حسین آباد ہائی اسکول لکھنو کا دردانگیز افسانہ ابھی ہمارے حافظہ سے محو نہیں ہوا ہے کہ باوجود سرمایہ کافی چل نہ سکا اور آخر میں گورنمنٹ کے حوالہ کرنا پڑا یہی حشر وکٹوریا ہائی اسکول غازی پور کا ہوا۔ اعظم گڈھ محمدن نیشنل ہائی سکول

اسلامیہ اسکول بدایوں باہمی ناچاقی کی قربان گاہ پر چڑھے۔ اور دور کیوں جائے
خود ہمارے مرکز تعلیم میں یعنی کالیجیٹ اسکول علی گڈھ کے نتائج امتحانات کس قدر
حوصلہ فرسا ہیں۔ بارہ بنکی، سیتاپور وغیرہ اضلاع اودھ میں جہاں مسلمان اہل دل
اور تعلقہ داروں کی کوئی کمی نہیں ہے اب تک کوئی کامیاب اسکول کھل نہیں سکا
بہرائچ جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے اور جہاں صرف درگاہ کی سالانہ آمدنی اسقدر
کافی ہے کہ دو ہائی اسکول چل سکتے ہیں اب تک باوجود اس کے کہ تعلیمی مد میں ہر
سال کافی رقم صرف ہوتی ہے کوئی مڈل اسکول بھی مسلمانوں کی طرف سے قایم نہ
ہو سکا۔ نانپارہ میں جہاں ریاست کا انتظام ایک نہایت ہی قابل اور روشن خیال
بزرگ کے ہاتھ میں ہے کسی قومی تعلیم گاہ کا انتظام نہ ہو سکا۔

انتظام مدارس کا طریقہ جمہوری ہو یا شخصی

لیکن اٹاوہ میں ایک تہی دست اور بے مایہ مگر قوم کا سچا مخلص خدا کا نام لیکر
اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنی ان تھک کوششوں سے ایک ایسا بے نظیر ہائی اسکول
قایم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو نہ صرف باعتبار نتیجہ امتحانات بلکہ بلحاظ تربیت
اخلاق و کمی مصارف قومی مدارس میں پہلی مثال ہے۔ لہذا اگر منطق استقرا کے اصول
پر جزئیات سے کلیات کا استخراج جائز ہے تو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ قومی
مدارس کی کمی ہمارے عدم خلوص و استقلال اور فقدان صلاحیت نظم و نسق کا
نتیجہ ہے نہ افلاس و تہی دستی کا۔ دوسرا نتیجہ جو اسی اصول پر اخذ کیا جا سکتا ہے وہ
یہ ہے کہ تحریکات قومی میں جمہوریت اصولاً خواہ کسی قدر دل فریب کیوں نہ ہو مگر
بحالت موجودہ مناسب یہی ہے کہ جب تک قومی اخلاق کا معیار بلند نہ ہوئے اُس
وقت تک قومی تعلیم گاہوں کا انتظام کمیٹی کے بجائے اشخاص کے ہاتھ میں ہو۔ ورنہ

ساجھے کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹے گی ۔لیکن وقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں جمہوریت کا خیال استعداد عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے لہذا اس ہنگامۂ حرّیت اور غلغلۂ مساوات میں کوئی تحریک اوس وقت تک قبولیت عام حاصل نہیں کرسکتی جب تک کہ جمہوریت کا لذیذ چٹخارا بھی نہ دیا جاے - اس لئے انتہائی حدود کے درمیان میں ایک معتدل شاہراہ قایم کرنی پڑے گی جو افراط اور تفریط دونوں سے خالی ہو اور دونوں طرح کے محاسن کی جامع ہو

اگر مدارس کا انتظام کمیٹی کے ہاتھ میں ہو تو اُس کا نظام کیا ہوگا

یہ مسئلہ کہ مجالس ملی اور مجامع قومی کا نظام کیا ہونا چاہیئے بہت تفصیل طلب اور معرکۃ الآرا ہے جس کی گنجایش ان چند اوراق میں نہیں ہوسکتی - یہاں ہمیں صرف چند بنیادی اُصول بیان کر دینے ہیں حیرت سرائے فطرت کے نظام پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کارگاہ وجود کا ذرہ ذرہ اجتماع نقیضین اور تنازع ضدین کا ایک دلکش مرقع ہے

اتحاد فی الاختلاف اور اختلاف فی الاتحاد کے متعلق فلسفیانہ بحث

حکما نے ثابت کر دیا ہے کہ فضاے عالم میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو ایک وقت دو مختلف قوٰے کے زیر عمل نہو کرۂ ارض جو آفتاب کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے دو مختلف قوٰے کے زیر اثر ہے - جذب مرکزی کی قوت اسکو آفتاب سے ملصق کر دینا چاہتی ہے لیکن ساتھ ہی دفع مرکزی کی طاقت اسے فرار اور افتراق کا سبق سکھاتی ہے - عناصر جن سے تمام چمنستان آفرینش کے بوقلموں ہستیاں مرکب ہیں باوجود اس ترکیب اور اختلاط کے باہم متناقض اور متبائن ہیں بجنسہ اسی طرح کائنات میں آپ کو مشکل سے کوئی ایسا وجود مل سکے گا جو اپنی ذات میں کوئی نہ کوئی شان امتیاز و انفراد نہ رکھتا ہو - تاہم ہر وجود میں بہت سے ایسی صفات ہوتی ہیں جو دوسری موجودات

میں بھی مشترک ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ گو ہر ایک ہستی زبانِ حال سے یکتائی اور انانیت کا دعوی کرتی ہے تاہم متجانس اور متماثل موجودات سے اختلاط اور تقرب کی آرزو رکھتی ہے۔ بنی نوع انسانی اس عام کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ مختلف اقوام اور طبقات کی تفریق اسی کا نتیجہ ہے پھر ہر طبقہ اور ہر قوم میں بجاے خود مختلف گروہ اور جماعتیں بھی ہونی چاہئیں اور رہیں اس تقریر کا ماحصل یہ ہی کہ قوم کے تمام افراد کو متحد الخیال بنانے کی کوشش فطرت سے جنگ کرنے کے برابر ہے اختلاف راے ہمیشہ سے رہا ہے اور رہے گا اور اس کے مٹانے کی کوشش ابتدا سے ناکام ہوتی آئی ہے اور رہوگی البتہ اس اختلاف کو مخالفت و مجادلہ اور تصادم تک ممتد ہونے سے بچانا محبان قوم کا سب سے پہلا فرض ہے۔

مختلف الخیال جماعتوں کا اپنی اپنی جگہہ پر علیحدہ علیحدہ اشاعت تعلیم کی کوشش کرنا

لیکن اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ مختلف طاقتوں کو ملانے کی کوشش کی جاے بلکہ بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ حتی الوسع اُن کو باہم ٹکرانے سے بچایا جاے اور جہانتک ممکن ہو انہیں ایسے فاصلہ پر رکھا جاے جس سے خطرہ کا اندیشہ پیدا نہو سکے۔ اکثر قومی انجمنیں جو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتیں یا قومی مدارس جو بدنظمی کا شکار ہو جاتے ہیں اس کا سبب محض اس قدر ہوتا ہے کہ خود اوس کی بنیاد غلط ہوتی ہے اور مختلف الخیال افراد کو یکجا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا نتیجہ آخر میں یہ ہوتا ہے کہ باہمی کشمکش اور مناقشت کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ساری عمارت زمین پر آرہتی ہے مثال کے طور پر ہم مجلس "ندوۃ العلماء لکھنو" اور "مدرسہ عالیہ دیوبند" کو پیش کر سکتے ہیں۔ اوّل الذکر میں چونکہ مختلف الخیال اور مختلف المذاہب جماعتوں کو متحد

کرنے کی سعی محال کی گئی تھی اس لئے چند ہی دنوں کے بعد اختلافات شروع ہو گئے اور کچھ نہ کچھ اب تک باقی ہیں۔ لیکن دیوبند میں چونکہ صرف ایک متحد الخیال جماعت نظم ونسق کی ذمہ دار تھی لہذا باوجود اس کے کہ زمانے کی رو کے خلاف جمود اور تقشف میں ضرب المثل ہے روز بروز ترقی ہوتی رہے ہندوؤں میں دیکھئے آریہ، برہمو سماج، جینی اور پھر سناتنی اور پھر سناتنیوں میں برہمن چھتری کایستھ اور دوسری قوموں کے الگ الگ مدارس ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن میں آئے دن اختلافات کے ہنگامے نہیں اُٹھتے۔

دیکھئے علی گڈھ کالج کے ارکان چونکہ ابتدا میں متحد الخیال تھے لہذا ترقی کرتا رہا۔ بعد کو بیشک کچھ اختلاف پیدا ہو گئے تھے اور اندیشہ تھا کہ یہ بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے لیکن قوم کی خوش قسمتی سی مولوی سمیع اللہ خان صاحب اور دیگر ارکان جو اختلاف رائے رکھتے تھے علیحدہ ہو گئے اور یہ ناؤ ڈوبنے سے بچ گئی۔ لیکن افسوس کہ اب پھر اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جو نہایت خطرناک مستقبل کا خوف دلا رہے ہیں۔ کاش ان مختلف الخیال گروہوں میں سے کوئی حسبۃً للہ اس سے علیحدہ ہو جائے اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنالے تو نہ صرف یہ مرکز تعلیم زمانہ کی چشم بد سے محفوظ رہے بلکہ اس کے مقابلہ پر ہمیں ایک دوسری قومی تعلیم گاہ کے قیام پر اظہار مسرت کا موقع ملے۔

ارکان مجلس منتظمہ میں اتحاد خیال کی ضرورت اور آئندہ اختلافات سے بچنے کی تدبیر

اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ سب سے پہلا اصول جس کا لحاظ کسی قومی تعلیم گاہ کی انتظامیہ جماعت کو اپنے نظام میں رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس کے تمام ارکان متحد الخیال اور متحد المقاصد ہوں اور آئندہ جدید اختلافات

سے بچنے کے لئے دو باتوں کا لحاظ ضروری ہوگا

(۱) جماعت کے مقاصد اور شاہراہ عمل کو نہایت تفصیل صراحت اور جامعیت سے پہلے ہی طے کر لینا چاہئے تاکہ آیندہ جو رکن کسی وجہ سے اپنی راے تبدیل کرے اور مقاصد متعینہ کے کسی جزو سے اختلاف رکھتا ہو اوس کو ایسی جماعت میں شرکت کا حق نہ ہو اور اوس کو فوراً علیحدہ ہو جانا پڑے۔

(۲) معتمد کے اختیارات زیادہ وسیع ہوں تاکہ ذرا ذرا سی باتوں میں آئے دن اختلافات پیدا نہ ہو سکیں۔ جماعت انتظامیہ سے صرف امور مہمہ میں استصواب کیا جاے اور اس کو صرف امور کلیہ میں مداخلت اور مصارف سالانہ کی جانچ کا حق ہو باقی تمام جزئی امور کا فیصلہ معتمد یا ناظم کے ہاتھ میں ہو۔ یہ شخصیت اور جمہوریت کا معجون مرکب القوی دونوں کے فوائد کا جامع اور دونوں کے نقائص سے پاک ہوگا۔

یہاں تک تو ہم نے مختصراً خود جماعت انتظامیہ کی نوعیت اور اوس کی ارکان کی باہمی حقوق و اختیارات کے متعلق چند موٹے موٹے اصول بیان کر دیے ہیں اب ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ جماعت منتظمہ اور طبقہ مدرسین کے باہمی تعلقات کیا ہوں گے۔ اور آگے چلکر یہ عرض کر دیں گے کہ جماعت طلبا کے حقوق اور پابندیاں کیا کیا ہونی چاہئیں اور مدرسین اور منتظمین سے ان کا کیا اور کہاں تک تعلق ہونا چاہیے۔

مجلس منتظمہ اور جماعت اساتذہ کے تعلقات

اسٹاف اور ارکان انتظامیہ کے تعلقات :۔

مسئلہ مذکورۂ عنوان کے متعلق بھی بدقسمتی سے قوم میں نہایت سخت اختلافات

ہیں ایک گروہ جو اپنے آپ کو جدید الخیال اور حریت پسند کہتا ہے اور تمام خارجی قیود سے آزاد ہونا اپنا نصب العین سمجھتا ہے اوس کی راے خود اس کے عقائد سیاسی کے بالکل خلاف ہے۔ اس طبقہ کے نزدیک مدرسین کو جماعت منتظمہ کے ہاتھ میں محض غیر ذی روح آلات کی طرح رہنا چاہیے جن کو ہر ہر قدم پر ارباب حل وعقد کی ہدایات کے مطابق عمل کرنا لازم ہے اور جس طرح ایک کٹ پتلی بازی گر کے اشاروں پر ناچتی ہے اسی طرح مدرسین کو بھی اپنی اپنی تمام حرکات وسکنات میں ارکان انتظامیہ کا تابع ہونا ضروری ہے۔ غرضکہ جس حریت کو وہ اپنے لئے لازمۂ حیات سمجھتے ہیں وہی اون کے ماتحتوں کے لئے سم قاتل بن جاتی ہے گویا آزادی بھی کوئی مادی چیز ہے جس کو دوسروں سے سلب کرکے اپنے ذخیرہ آزادی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

بعینہ یہی تناقص دوسرے فریق کے عقائد سیاسی وتعلیمی میں ہے۔ کیونکہ قدامت پسند طبقہ جو اپنے آپ کو اطاعت اور فرماں پذیری کا مجسمہ سمجھتا ہے۔ اپنے ماتحتوں کو اس قدر آزاد بنانے کا آرزومند ہے کہ وہ فعّال ما یرید بن جائیں اور جماعت منتظمہ کو اُن کے افعال کی بازپرس کا کوئی حق نہ ہو۔ انصاف یہ ہے کہ ہر شے کو اپنے محل پر اور ہر کام کو اپنے موقع پر ہونا چاہیئے۔ نہ سرتاپا آزادی مفید ہے نہ یک لخت پابندی کارآمد ہوسکتی ہے۔ خیرالامور اوسطہا۔ جماعت منتظمین عموماً ایسے حضرات سے مرکب ہوتی ہے جو خواہ کسی قدر قابل تعلیم یافتہ۔ روشن خیال اور تجربہ کار کیوں نہ ہوں اور خواہ اصول تعلیم میں اون کو کتنی ہی دسترس کیوں نہ ہو فن تعلیم کی جزئیات سے وہ یقیناً ناآشنا ہوتے ہیں۔ یونہیں ہر مدرس کی ذاتی قابلیت اور ہر ایک طالب علم کی رجحان طبیعت سے اون کو واقفیت نہیں ہوسکتی علاوہ بریں بحالت موجودہ ارکان میں بہت سے ایسی بھی حضرات شامل ہوتے ہیں

جو وجاہت ذاتی، تمول یا خارجی نفوذ و اقتدار کی بنیاد پر محض زینت محفل کے لئے رکن بنائے جاتے ہیں ان حضرات میں نہ تو اتنی علمی قابلیت ہوتی ہے نہ اپنے ماحول کے اعتبار سے ان کو اس کا موقع ملتا ہے کہ وہ مسئلہ تعلیم کے دقیق نکتوں پر غور کریں۔ لہذا ایسے حضرات کو مدرسہ کے اندرونی حالات، اوقات درس کے تعین، کتب درسیہ کے تقرر۔ طلبا اور اساتذہ کے باہمی تعلقات میں مخل ہونا دخل درمعقولات سے کم نہیں۔ لہذا جماعت منتظمہ کو صرف اُصولی اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے چاہئیں اور جزئیات کو بالکل مدرسین پر چھوڑنا چاہیئے۔ مثلاً حسب ذیل باتیں جماعت انتظامیہ کے ہاتھ میں ہونی چاہئیں۔

(۱) مدرس اعلیٰ کا تقرر و موقوفی

(۲) ماتحت مدرسین کا انتخاب۔ مگر اس صورت میں مدرس اعلیٰ سے استصواب کر لینا لازمی ہوگا

(۳) تعداد مدرسین اور طلبا کی تعیین

(۴) غریب طلبا کو عطائے وظائف

(۵) ایام تعطیل کی تعیین

(۶) نوعیت تعلیم کا فیصلہ

(۷) ترقی تنخواہ مدرسین بہ استصواب مدرس اعلیٰ

(۸) فصل خصومات مہمہ مابین جماعت طلبا و مدرسین

باقی تمام انتظامات اندرونی میں مدرسین کو آزاد رہنا چاہیئے مثلاً ہر جماعت کے مدرس کو حق ہوگا کہ وہ اپنے شاگردوں کو بصورت نافرمانی ایک خاص حد تک جسمانی سزا دے سکے یا کسی خاص قسم کی پابندی عائد کر سکے۔ مدرس اعلیٰ کو یہ حق ہو کہ وہ اپنے ماتحتوں سے بازپرس کر سکے۔ علیٰ ہذا طلباء کی تمام حرکات و سکنات کی نگرانی اور اُنکے

داخلہ اور اخراج کے متعلق کافی اختیارات رکھتا ہو۔ جماعت انتظامیہ میں مدرس اعلیٰ کا بھی شمول ہونا چاہیے تاکہ تعلیمی معاملات میں اُس کے مشوروں سے فائدہ اُٹھایا جاسکے

اصول وطرق تعلیم

ہمارے ملک میں اور بالخصوص ہماری قوم میں جو طریقۂ تعلیم رائج ہے اور جن تعلیمی اصولوں کے ماتحت آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے اور باعتبار نتائج کے جو تغیر اور تبدل اور ترمیم و تنسیخ ضروری ہے اوس کے متعلق غور اور بحث کرنا ایک ایسا مبحث ہے جو نہ صرف حامیان تعلیم کی توجہ کے لئے ضروری ہے بلکہ پبلک میں ان مسائل کے ساتھ دلچسپی پیدا ہونا ملکی ترقی کے لئے فال نیک ہے۔ لیکن طرز تعلیم کے نقائص اور کوتاہیوں پر غور بحث سے پہلے یہ مناسب ہے کہ اُن تعلیمی اصولوں اور طریقوں کو اختصار کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیا جائے جو ازمنہ ماضیہ میں مختلف اقوام اور مختلف ممالک میں رائج رہے ہیں۔ اور دکھلایا جاسے کہ وہ کہانتک نتائج کے لحاظ سے قومی یا انفرادی حیثیت سے نفع بخش ثابت ہوئے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس اہم مبحث پر ہم سب سے پہلے اپنے مخدوم و مکرم دوست جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم ایس سی، ڈی ایس سی، پی ایچ ڈی، سی آئی ای کا فاضلانہ مضمون درج کرتے ہیں۔ یہ مضمون چند اقساط میں درج ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے سال گذشتہ میں اس مبحث پر چند لیکچر سٹوڈنٹس یونین کلب محمدن کالج علی گڈھ میں دیے تھے اور یہ مضمون ان لکچروں کی بطور خلاصہ کے قلمبند کیا گیا اور جداگانہ رسالہ کی صورت میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔ اصل مضمون انگریزی زبان میں تھا جس کا اُردو ترجمہ مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے کیا ہے ہمیں یقین ہے کہ ناظرین اس مضمون کو دلچسپی اور غور کے ساتھ پڑھیں گے اور جناب ڈاکٹر صاحب سے توقع ہے کہ اپنے رشحات قلم سے وقتاً فوقتاً ہمکو ممنون کرتے رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

فن تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ

تمہید

مسئلہ تعلیم کی تاریخ ایک لحاظ سے فلسفۂ تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ نوع انسان نے جو ترقی ملک ہر زمانہ و ہر قرن میں ذہنی اور اخلاقی حیثیتوں سے کی ہے اس کے تمام حالات و کیفیات اور اس کے متعلق تمام معلومات پر مسئلہ تعلیم کی تاریخ مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ مبحث اس قدر وسیع ہے کہ یہ مختصر اوراق اس کے بیان کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ اس مسئلہ کی ایک محدود شاخ یعنی تاریخ تدریس ہی کو پورے طور سے بیان کرنا اس کی وسعت کے باعث بالاتر ہے۔ تاریخ تدریس کے مؤرخ کا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ وہ اُن تمام اصول و مسائل کو بیان کرے جو ماہرین فن نے وقتاً فوقتاً دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں بلکہ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ فن تدریس کے باب میں جو کچھ عملاً کیا جا چکا ہے اس کو بالتفصیل بیان کرے اور جو تعلیمی انسٹیٹیوشنز اور درسگاہیں مختلف زمانوں میں قایم کی گئیں ان کا خاص طور سے مطالعہ کر کے اظہار رائے کرے۔ میں اس وقت صرف تاریخ تدریس کے چند ضروری مسائل پر اظہار خیال کروں گا۔ یہ مسائل بھی بطور خود مسئلہ تعلیم کا ایک ضمنی جزو ہیں۔ ان مسائل کا بیان حسب ذیل چار حصّوں میں کیا جائے گا:-

حصّہ اول میں مسئلہ تعلیم کی تاریخ علمی و عملی حیثیتوں سے بیان کی جائے گی۔ میری رائے میں اس کا جاننا زمانہ حال کے تعلیمی اصول کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے کے لئے ضروری ہے۔

حصّہ دوم میں اُن طریقوں کا بیان ہو گا جو فی زمانا ترقی یافتہ ممالک میں مروّج ہیں مثلاً

انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، مصر، امریکہ و جاپان وغیرہ میں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس سے ہم کو یہ رائے قایم کرنے میں مدد ملے گی کہ ہندوستان میں جو طریقہ تعلیم و تدریس اس وقت رائج ہی وہ کہاں تک صحت پر مبنی ہی اور اگر نہیں ہے تو کون طریقہ اختیار کرنا مناسب ہی۔

حصہ سوم میں بچوں کی خانگی اور مکتبی تعلیم پر بحث ہوگی اور ان ہر دو طریقہائے تعلیم کی خوبیوں اور برائیوں کو ظاہر کیا جائے گا۔ اس حصہ میں بحث کرتے وقت پیدایش سے لے کر سن رشد تک بچے کی حالت مدنظر رہے گی۔

حصہ چہارم میں اُن طریقہائے تعلیم کا بیان ہوگا جو اس وقت ہندوستان میں عام طور سے مروج ہیں یا جن کا رواج دینا مناسب ہی۔

اس مضمون میں میں نے صرف اول حصہ پر بحث کی ہی باقی تینوں حصّوں پر میں کسی دوسرے وقت اپنے خیالات پیش کروں گا۔

اصلی موضوع کے متعلق اظہار خیال کرنے سے قبل میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ تعلیم نہایت وسیع مضمون ہی لیکن باوجود اس کی وسعت کے شاید ہی کوئی متنفس ممالک متحدہ میں ایسا ہوگا جو اس اہم مسئلہ کے ایک نہ ایک پہلو سے ذاتی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ اگرچہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ مختلف مضامین درسیہ کی درس تدریس کے طریقوں سے صرف ان ہی لوگوں کو دلچسپی ہو سکتی ہی جو تعلیم و تعلم کو بطور پیشہ کے اختیار کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ کے بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں جن سے کوئی باشندۂ ملک اپنی ذات کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا اور یہی وہ امور ہیں جن کے متعلق میں اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً بچوں کی تربیت، تعلیم کی غرض و غایت یا اس ملک اور ممالک غیر کی درسگاہوں کا طریقہ تعلیم و تدریس اور اسی مقصد سے میں نے اس مضمون کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہی۔

ہندوستان میں عام طور پر تعلیم کا مفہوم صحیح طور سے نہیں سمجھا جاتا اور اس بارے میں غلط رائے قایم ہو گئی ہی۔ مسلمانوں نے تو ایک عرصہ تک اور میں یہ عرض کروں گا کہ شاید

کچھ حد تک اب بھی موجودہ انگریزی تعلیم کو علم کی غرض سے حاصل نہیں کیا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے اپنے ایک لکچر میں ایک موقع پر قدیم زمانہ کے ایک جید عالم کی گفتگو کا ذکر کیا تھا جن کو دوران گفتگو میں نواب صاحب مرحوم سے یہ معلوم ہوکر نہایت تعجب ہوا تھا کہ اقلیدس علم ہیئت اور ارسطو کا فلسفہ بھی انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ حقیقتاً اب تک انگریزی تعلیم صرف کسب معاش کا وسیلہ سمجھا گیا اور سمجھا جاتا ہے دوسری طرف حکومت نے ملازمت کے لئے یونیورسٹیوں کے خاص خاص امتحانات پاس کرنے کی لازمی شرط قرار دی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کے نزدیک، سررشتہ تعلیم کے نزدیک، ممبران اسکول کے نزدیک حتیٰ کہ پبلک کے نزدیک انگریزی تعلیم کا مطمح نظر (آئیڈیل) یہ قرار پایا کہ یونیورسٹی کے امتحانات پاس کر لئے جائیں اور اسی معیار سے اور صرف اسی معیار سے ہر ایک پروفیسر کی لیاقت اور ہر ایک تعلیم گاہ کی کامیابی کی آزمائش کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تعلیم کی غرض و غایت ہی صرف امتحان پاس کر لینا ہو تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان درسگاہوں سے محقق و مجدد لوگ اور ہر شعبہ زندگی کے لئے کاملین فن پیدا ہوسکیں۔

ہندوستان میں اگر اصلی تعلیم پھیلانا مقصود ہے تو تعلیم کے مطمح نظر کو بالکل تبدیل کرنا پڑیگا اور اس کی علت غائی صرف امتحانات پاس کر لینا نہ سمجھی جائے گی بلکہ تعلیم کی غرض و غایت وہ شے ہوگی جس کی تشریح کومی نس[۱]، لاک[۲]، روسو[۳]، پستالوزی[۴] نے کی ہے اور جس کی تفصیل آیندہ صفحات پر درج ہے۔ اس اعتبار سے ایک امی شخص بھی اکبر اعظم و سلطان علاء الدین خلجی کی طرح تعلیم یافتہ کہلایا جا سکتا ہے اور ایم اے اور ایل۔ ایل ڈی کے ڈگری یافتہ غیر تعلیم یافتہ ہوسکتے ہیں۔ تعلیم اور شے ہے اور نوشت و خواند میں قابلیت پیدا کر لینا اور چیز ہے۔ نوشت و خواند تعلیم کا ادنیٰ جزو ہے جس کی وضاحت لاک نے تفصیل کے ساتھ کی ہے۔

ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کی جدید تعلیم اپنے منصوبوں میں کامیاب نہیں

۱؎ Comenus ۲؎ Lock ۳؎ Roussean ۴؎ Pestalozzi

ہوئی۔ اس ناکامی کے لوگوں نے اپنی اپنی رائے اور خیال کے مطابق مختلف وجوہ اور مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ہماری تعلیم غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے نامکمل رہجاتی ہے۔ بعض لوگ اس نقص کو اُستادوں کی ناقابلیت اور والدین کی عدم توجہی پر محمول کرتے ہیں لیکن میری ناچیز رائے میں اس نقص کا سب سے بڑھکر سبب یہ ہی کہ ہم نے تعلیم کے مفہوم کو پورے طور سے نہیں سمجھا اور جب کبھی اور جہاں کہیں بھی تعلیمی درسگاہیں قایم کیں وہ تعلیم کے صیحح مفہوم سے الّا ماشاءاللہ ہٹی ہوئی تھیں۔ عام تعلیم کے لئے کسی خاص علم کا سیکھنا یا کسی خاص زبان کے ذریعہ سے سیکھنا ضروری نہیں۔ السنہ اور علوم کا انتخاب کرنا باشندگان ملک کے حالات اور ضروریات پر منحصر ہے۔ ایک ملک میں ایک زبان زیادہ مفید اور ضروری ہی، دوسرے ملک میں دوسری، مگر تعلیمی اصول ان سب قیود سے مبرّا اور تمام ملک اور تمام اقوام کے لئے یکساں ہیں۔

خاکسار

ضیاءالدین احمد

بابِ اوّل

علم فلسفہ کی تاریخ قلمبند کرتے ہوئے ایک مصنف نے تمام زورِ قلم صرف اس تحقیق پہ صرف کیا ہی کہ آیا حضرت آدم علیہ السّلام بھی فیلسوف تھے ؟ اسی طرح علم التعلیم کے بعض مؤرخ اپنی خداداد قابلیتیں اور ذکاوت وفراست اس بات پر صرف کرتے اور اس میں باریک نکات نکالتے ہیں کہ ازمنہ سابقہ میں وحشیوں کی تعلیم کیونکر ہوتی تھی اور حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جب پہلا انسانی خاندان بنا ہوگا تو اس میں تعلیم کی کیا کیفیت ہوگی لیکن میرا منشاء فن تعلیم کی تاریخ بیان کرنے سے ہرگز یہ نہیں کہ اس قدر قدیم زمانہ کے حالات کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کراؤں بلکہ برخلاف اس کے ان اوراق میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اُن اقوام سے متعلق ہی جن کے تعلیمی اصول اور مسئلہ تعلیم کی بابت جن کے کارناموں نے باشندگان ہند کی تعلیم پر بالعموم اور مسلمانان ہند کے تعلیمی اصول پر بالخصوص خاص اثر ڈالا ہی۔

قدیم ہندوستان کے باشندوں میں تعلیم کا طریقہ

زمانہ قدیم میں تعلیمی اصول کی بنیاد ملک چین میں روایات قدیمہ پر اور ہندوستان میں ذات پات کے لحاظ سے قائم ہوئی ۔ ہندوستان کے باشندے چار ذاتوں یا فرقوں میں منقسم تھے اور جو شخص جس ذات یا فرقہ میں پیدا ہوتا اس پر اسی ذات یا فرقہ کے مراسم و رواجات کا سیکھنا اور ان پر عمل کرنا فرض تھا اور ان ہی مراسم و رواجات کا سیکھنا بچّہ کی تعلیم کا اہم جزو خیال کیا جاتا تھا۔ البتہ شودر لوگوں (یعنی طبقہ ادنیٰ کے لوگوں) اور عورتوں کو ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت تھی تعلیم حاصل کرنا صرف بقیہ تین اعلیٰ طبقوں کے مردوں کا حصّہ تھا یعنی برہمن، چھتری اور ویش ذات کے مردوں کا۔

پاٹ شالے

چھہ یا سات سال کی عمر ہو جانے پر بچّے کو مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ ان مدرسوں یا پاٹ شالوں میں بالعموم کوئی برہمن مہاراج درس دیتے تھے۔ اُستاد یا گروجی کی

نہایت درجہ تعظیم و تکریم ہوتی تھی اور شاگرد (یا چیلا) اپنے والدین سے زیادہ اپنے گرو کی تعظیم و تکریم کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتا تھا۔ پڑھائی بالعموم میدان میں کسی سایہ دار درخت کے نیچے ہوتی تھی ناموافق اور خراب موسم میں البتہ کسی چھپر کے نیچے یا جھونپڑے میں درس و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ پوجا پاٹ (مذہبی مراسم) اور اخلاقی تعلیم کے علاوہ لکھنا پڑھنا اور حساب بھی سکھلایا جاتا تھا۔ املا کی مشق ابتداءً تختیوں پر پنڈول سے کرتے تھے۔ گروجی کے علاوہ چھوٹے بچوں کو بڑے لڑکے بھی سبق پڑھاتے اور سب طالب علم باہم آواز ملا کر چلا چلا کر پڑھتے تھے۔ آداب اور ضابطہ میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ اگر فہمایش اور نصیحت سے کام نہ چلتا تو اس حالت میں جسمانی سزا دی جاتی تھی۔ جسمانی سزا یا تو تھپی مار کر یا ایسے طریقوں سے دی جاتی تھی جو ہندوستان کی خاص خصوصیت ہیں مثلاً مرغا بنانا یا سرد پانی کا ترڑیڑا دینا۔

اعلیٰ تعلیم کے نصاب کی مدت بارہ سال تھی اور یہ برہمن لوگوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس میں صرف و نحو، ریاضی، معانی و بیان، فلسفہ، علم ہیئت، علم طب اور قانون کی تعلیم ہوتی تھی لیکن جسمانی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا کیونکہ یہ لوگ قدرتاً جسمانی تربیت سے متنفر تھے۔ ان کے نزدیک اچھی اور خوش گزران زندگی کھانے پینے اور آرام کرنے پر محدود تھی اور انتہائی خوشی صرف نروان تھی۔ قدیم ہندوستان کے باشندے فطرتاً تخیلات کے بندے تھے اور ان کے مذہب کی تعلیم اس فطری رجحان کی موید تھی۔ ان کے نزدیک سچی خوشی اسی پر مبنی تھی کہ نفس امارہ کو تابع کرے اور دنیائے دنی کے خیالات کو ترک کرے۔ ان کے نزدیک یہی صحیح تعلیم کا آئیڈیل تھا۔

بنی اسرائیل

(Israelites or Hebrews)

بنی اسرائیل کا عہد تقریباً چار ہزار برس تک رہا اور اس مدت مدید میں اس قوم کو کبھی تو فراغت

اور مرفہ الحالی سے بہرہ اندوز ہوتے اور کبھی فلاکت و بدبختی کی سختیاں برداشت کرنے کے گوناگوں مواقع پیش آئے۔ جب مصیبت کے دن آئے اور ایک بالشت زمین بھی اُن کے قبضہ میں نہ رہی تو خانہ بدوشی کی حالت میں یہ لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوتے رہے لیکن اپنی قومی خصوصیات اور رسم و رواج کے نہایت سختی کے ساتھ پابند رہے۔ یہی وہ قوم ہے جس میں تمام ادیان صادقہ کی بنیاد پڑی اور اخلاق فاضلہ کا ایک ایسا نظام اس قوم کی بدولت دنیا کو ملا جو عیوب و نقائص سے مُبرّا و منزّہ ہے۔

یہودیوں میں تعلیم کا مقصد

یہودیوں میں تعلیم کا مقصد و منشا یہ تھا کہ خدائے حی و قیوم کے فرمانبردار اور مطیع و منقاد بندے پیدا کئے جاویں۔ یہ لوگ اپنے دروازوں اور پھاٹکوں پر کلام الٰہی کو منقوش کرتے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشت و خواند کا طریقہ قدیم زمانہ کے یہودیوں میں عام طور سے رائج تھا لیکن مردوں ہی تک محدود تھا۔ لڑکیوں کو سینا پرونا چرخہ کاتنا اور کھانے پکانے اور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہی وہ تعلیم ہے جو ہم اس زمانہ میں بھی "ڈومیسٹک اکانومی" Domestic Economy (امور خانہ داری) کے تحت میں اپنی لڑکیوں کو دیتے ہیں۔ یہودیوں میں موسیقی کا بھی رواج تھا۔

طریقہ تعلیم

قدمائے یہود میں تعلیم زیادہ تر خانگی طور سے دی جاتی تھی لیکن پہلی صدی عیسوی میں مدارس قائم ہوئے ۶۴ء میں بطریق اوّل جوشوا ابن غمالہ نے ہر قصبہ کے باشندوں کو مدرسہ کی مالی مدد کرنے پر بذریعہ احکام مجبور کیا اور درصورت خلاف ورزی اُن کو برادری سے خارج کیا جاتا تھا۔ اگر بچوں کی تعداد ۲۵ سے متجاوز نہ ہوتی تو مدرسہ کے لئے ایک ہی اُستاد ہوتا تھا اور ۲۵ سے زیادہ بچوں کے لئے قصبہ کے باشندوں کو ایک مددگار معلم مقرر کرنا پڑتا تھا اور ۴۰ سے زیادہ تعداد کے لئے دو اُستاد مقرر ہوتے تھے۔

صوبجات ممالک متحدہ میں جو اصحاب مکاتب کے قیام اور اُن کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے یہودیوں کے ابتدائی تعلیم کے مفصّل قواعد و احکام کا مطالعہ کارآمد ہوگا۔

اُستاد کا درجہ مثل دیگر اقوام قدیمہ کے بنی اسرائیل میں اُستاد کا بہت بڑا درجہ تھا ان کی نہایت توقیر و تعظیم ہوتی تھی اور اُن کو صحیح معنوں میں سرپرست ملک خیال کیا جاتا تھا توریت میں مذکور ہے کہ "اگر تمہارے اُستاد اور تمہارے باپ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہو تو باپ سے قبل اُستاد کی اعانت کرو کیونکہ باپ تو تمہاری دنیاوی زندگی کا باعث ہے اور اُستاد نے تم کو آخرت کی زندگی بہم پہنچائی ہے"

بنی اسرائیل میں تعلیم دینے کا طریقہ چھ سال کی عمر میں بچہ مدرسہ میں داخل ہوتا تھا اور سب سے پہلے توریت پڑھائی جاتی تھی۔ معلم کی خاص کوشش یہ ہوتی تھی کہ تلفظ صحیح ہو مطلب سمجھانے کے لئے اُستاد بار بار مطالب بیان کرتا تھا اور اگر ضرورت ہوتی تو اپنے بیان کو چار سو مرتبہ تک دُہرانے میں اس کو تامل نہ ہوتا تھا۔

مدارس میں نوشت و خواند، قدرے طبعیات اور زیادہ تر اُقلیدس و علم ہیئت پڑھایا جاتا تھا اور پڑھاتے وقت اخلاقی امور کی بھی تلقین ہوتی رہتی تھی۔

اگر ہم اس طریقہ تدریس کا جو سنہ عیسوی کے اوائل میں یہودیوں میں مروج تھا اپنے یہاں کے پُرانی طرز کے مکتب کی تعلیم سے مقابلہ کریں تو یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ ہمارے پُرانی طرز کے مکتب اب تک یہودیوں کے مدارس کے دقیانوسی نمونہ پر قائم کئے گئے ہیں اور باوجودیکہ زمانہ حال کے ماہرین فن تعلیم اور مصنفین نے نہایت صاف اور مُدلل طریقہ سے اس طریقہ تعلیم کے نقائص کا اظہار کر دیا ہے مگر ان مکتبوں میں قدیم زمانہ کی متروک طریقوں کو اب تک برقرار رکھا گیا ہے تعلیم و تدریس کا فن ممالک متمدنہ اور ترقی یافتہ اقوام میں ایک خاص سائنس ہو گیا ہے اور نہایت کامیاب اُصولوں کے ماتحت نئی نسلوں کے قوائے ذہنی و دماغی و جسمانی کی تربیت کی غرض سے نہایت وسیع پیمانہ پر انتظامات جاری ہیں لیکن اس ملک اور بالخصوص ہماری قوم میں وہی دقیانوسی اور از کار رفتہ طریقوں کی پابندی پر اصرار ہے

اہل یونان

تمام یونانی ریاستوں یا بالفاظ دیگر تمام یونانی شہروں میں سے صرف دو مشہور

صرف دو شہر یعنی اسپارٹا Sparta اور ایتھنز Athens تاریخ تعلیم و تعلّم کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے ہر شہر نے مختلف پہلوؤں پر اپنے تعلیمی مطمح نظر کے اعتبار سے ترقی کی تھی۔

اسپارٹا اس شہر میں یونانیوں کی ڈورین Dorain نامی ایک مضبوط اور بہادر قوم کے لوگ آباد تھے اور لائی کرگس Lycurgus نے جو نظام تمدن (قانون حکومت) قایم کیا تھا اس کی وجہ سے اس قوم کی فطری خصوصیات برقرار رہیں۔ اس مشہور مقنن کا خاص کارنامہ وہ حکم ہے جس کی بدولت بقول پلوٹارک Plutarch کے اس نے عیش و عشرت غرور و تکبر اور دولت سمیٹنے کی خواہش کو نیست و نابود کر دیا۔

اہل اسپارٹا کی تعلیم زیادہ تر جسمانی تربیت پر مبنی تھی۔ بچوں کو سلطنت کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ۷ سال کی عمر تک بچے اپنے قدرتی سرپرستوں کی حفاظت اور نگرانی میں رہتے اور اس کے بعد پبلک تعلیم گاہوں میں بھیج دیئے جاتے تھے جہاں اُن کو ایک درشت ضابطہ کا پابند ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ ۱۲ سال کی عمر ہو جانے پر اُن کو کسی قسم کے قمیص و بنیان پہننے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ صرف ایک کوٹ ملتا تھا جو سال بھر پہننا پڑتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں یہ بچّے ایک ساتھ رہتے اور ایسے بستروں پر سوتے جن کو وہ بغیر چاقو کی مدد کے درختوں کی ٹہنیاں توڑ توڑ کر خود اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔ جسم کو مضبوط اور سخت بنانے کے خیال سے جمناسٹک کی ورزشوں کی مشق کرائی جاتی تھی۔ غرضکہ ان کی تعلیم کا تمامتر دار و مدار اس قسم کی زندگی بسر کرتا تھا جو آجکل فوجی رنگروٹوں کو کیمپ میں بسر کرنا پڑتی ہے۔

اخلاقی تعلیم میں بہت سے پہلو قابل تعریف تھے۔ اسپارٹا کے نوجوانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ اپنی خواہشات پر قادر رہیں اور اپنی تمام عادات میں میانہ روی اور اعتدال کو قایم کریں۔ سردی و گرمی اور بھوک پیاس اور تکان کا ان کو عادی بنایا جاتا تھا۔

بزرگوں کا احترام والدین کی اطاعت، بڑوں کا ادب، اور مسلمہ و مروجہ واجبوں کے

احترام کا مادہ اُن میں پیدا کیا جاتا تھا۔ بڑوں کا ادب و احترام اس درجہ تھا کہ یہ بات بطور ایک مثل مشہور تھی کہ اگر بوڑھا ہو کر رہے تو اسپارٹا میں رہے۔ بڑوں کو ادب کے ساتھ جھک کر سلام کیا جاتا اور ان کے آنے پر سر و قد کھڑے ہو کر تعظیم کی جاتی تھی۔ جب کبھی بڑے آتے تھے تو ہر شخص جگہ خالی کر دیتا اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ ان کی نصیحتوں اور ان کے مشوروں کو سنتا اور ان پر عمل کرتا تھا۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایتھنز کے ایک تھیٹر میں ایک ضعیف آدمی کچھ دیر کر کے پہنچا اور وہاں اس کو جگہ نہ ملی۔ جبکہ وہ جگہ کے لئے متفکر کھڑا ہوا تھا تو ایتھنز کے چند نوجوانوں نے اس کو اپنی طرف بلایا جب بمشکل ان کے نزدیک پہنچا تو اُن نوجوانوں نے اس کو جگہ نہیں دی اور اُس کو کھڑا رکھکر مضحکہ اُڑایا۔ یہ معمر شخص گھبرا کر اُن نوجوانوں کے پاس سے دوسری طرف چلا جہاں ایک بنچ پر اسپارٹا کے سفرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس حالت کو دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو وہ تمام سفیر ل کر کھڑے ہو گئے اور ضعیف آدمی کو بڑے ادب اور توقیر کے ساتھ ہاتوں ہات لیا اور بٹھلایا۔ اس واقعہ کا بہت بڑا اثر باشندگان ایتھنز پر پڑا اور وہ اہلِ اسپارٹا کی اس خاص خوبی سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے نعرہ خوشی بلند کیا۔ اس پر ضعیف آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ "اہلِ ایتھنز تو صرف خوبیوں کو سمجھتے اور داد دیتے ہیں مگر اہلِ اسپارٹا ان خوبیوں پر عامل ہیں۔"

اہل اسپارٹا نے موسیقی کی تعلیم کو فراموش نہیں کیا تھا لیکن موسیقی کا ہمیشہ اخلاقی پہلو مدِ نظر ہوتا تھا اور عام طور سے ایسے محسنین قوم کی شان میں راگ الاپے جاتے تھے جنھوں نے اپنے ملک و قوم کے لئے اپنی جانیں قربان کیں تھیں۔

توانا اور مضبوط نسل کی افزایش کے خیال سے لڑکیوں کو بھی جمناسٹک کی ورزشوں کی مشق کرائی جاتی تھی۔

ایتھنز | سولن Solon نے جو منجملہ سات حکمائے یونان کے ایک مشہور حکیم اور ایتھنز

کے نظام کا بانی اور مقنن تھا جسمانی اور ذہنی تربیت کو مساوی درجہ پر رکھا ہے۔ سولن کا ایتھنز میں وہی رتبہ ہے جو لائی کرگس کا اسپارٹا میں تھا۔ اس کا قول ہے کہ بچوں کی تعلیم میں لکھنے پڑھنے اور تیراکی سیکھنے کو اور چیزوں پر فوقیت دینا چاہیئے۔ تعلیم کے متعلق یہ مطمح نظر ایتھنز والوں کے دلوں میں اتنا راسخ ہوگیا تھا کہ نہایت درجہ جہالت ظاہر کرنے کے لئے بطور مثل کے یہ فقرہ استعمال کیا جاتا تھا کہ "وہ نہ تو الف بے جانتا ہے اور نہ تیراکی"۔

ایتھنز کی جمہوریت میں صرف جسمانی تعلیم کے متعلق انتظام تھا۔ جمنازیم[ل] Gymnasium کے ڈائرکٹر کا ہر سال مجلس عامہ انتخاب کیا کرتی تھی۔ موسیقی اور صرف ونحو کے مدارس قایم کرنا پرائیوٹ کوششوں پر منحصر تھا۔ سولن نے اپنے مجوزہ قانون حکومت میں صرف ونحو جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم شہر کے مرفہ الحال باشندوں کے لئے اور نوشت وخواند و تیراکی اور کسی پیشہ کی تعلیم غربا کے لئے قرار دی تھی۔

ایتھنز میں چھ یا سات سال کی عمر تک کے بچے دایہ کی نگرانی میں رہتے تھے اور سات سال کی عمر ہونے پر اُن کو گرامر اسکول (مدارس زبان آموزی) اور جمنازیم میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ معلم صرف ونحو اکثر اوقات کھُلے میدانوں سڑکوں اور عام گذرگاہوں میں درس دیتے اور نوشت وخواند و مذہبی قصہ پڑھاتے تھے۔ ہومر Homer کی مشہور تصنیف لڑکوں کے درس میں داخل تھی۔ موسیقی کے مدارس میں اوّلاً گانے کی تعلیم ہوتی تھی اور اس کے بعد سارنگی اور ستار بجانا سکھایا جاتا تھا۔

حکمائے سوفسطائیہ (Sophists)

گرامر اسکولوں کی بدولت اہل ایتھنز میں ہر قسم کے علوم سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور ان کے سیاسی نظام کے لئے بحث ومباحثہ اور تقریروں میں خاص مہارت کی ضرورت تھی

[ل] قدیم یونان میں ایک قسم کا مدرسہ۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مُعلمین کے ایک نئے گروہ کو عروج حاصل ہوا۔ یہ لوگ اپنے تئیں سوفسطائی (یعنی دانشمند) سے موسوم کرتے تھے۔ اور ہر چیز کے سکھانے کے دعویدار تھے۔ یہ لوگ نوجوانوں کو ایسا برق کر دیتے تھے کہ بحث و مباحثہ میں دلیل کے دونوں پہلوؤں کو کامیابی کے ساتھ نباہ سکیں۔ معمہ اور چیستاں کے استعمال کرنے میں ان کو کمال حاصل تھا جو معمے منطق کی کُتب درسیہ میں مندرج ہیں ان کے ایجاد کا سہرا زیادہ تر ان ہی حضرات کے سر ہے۔ جو معمے کہ عام طور سے استعمال ہوتے تھے ان میں سے بطور نمونہ کے ایک کو یہاں درج کرتے ہیں:۔

ایک شاگرد نے قانون کی تعلیم ایک اُستاد سے حاصل کی اور شرط یہ کی کہ جس وقت وہ پہلا مقدمہ جیتے گا پانچسو روپیہ اُستاد کو دے گا۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاگرد نے وکالت شروع نہیں کی۔ اُستاد نے جب پانچسو روپیہ مانگے تو اُس نے پہلے مقدمہ کی جیت کی شرط کو یاد دلایا اور صاف ظاہر ہے کہ وکالت نہ کرنے کی حالت میں اُستاد کو روپیہ مانگنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس پر اُستاد نے جج کے سامنے دعویٰ دائر کر دیا چونکہ دونوں قانون دان تھے اس لئے بذات خود مقدمہ کی پیروی کرنے لگے۔ دوران مقدمہ میں اُستاد نے جج کو مخاطب کرکے کہا کہ مائی لارڈ! آپ کا فیصلہ کچھ ہی کیوں نہ آپ مجھکو پانچسو روپیہ میرے شاگرد سے دلوا دیجے۔ اگر فیصلہ میرے موافق ہو تو میں آپ کے حکم سے پانچسو روپیہ کا مستحق ہوں اور اگر فیصلہ میرے شاگرد کے موافق ہو تو یہ پہلا موقعہ ہے کہ وہ جو مقدمہ جیت رہا ہے اور اس لئے ہمارے عہد کے اعتبار سے مجھکو پانچسو روپیہ ملنے چاہئیں۔ اس کے بعد شاگرد کھڑا ہوا اور کہا کہ مائی لارڈ! آپ کا فیصلہ کچھ ہی کیوں نہو میرے اوپر روپیہ نہیں نکلتا اگر آپ کا فیصلہ میرے موافق ہو تو آپکے حکم کے اعتبار سے پانچسو روپیہ دینے سے میں بری ہو گیا اور اگر آپ کا فیصلہ میرے خلاف ہو تو چونکہ پہلا مقدمہ ہار رہا ہوں اس لئے میرے ذمہ روپیہ واجب الادا نہیں ہے۔ ان منطقی دلائل سے جج اس قدر پریشان ہوا کہ وہ ایک عرصہ

تک اس کا فیصلہ دینے سے قاصر رہا۔

سوفسطائی طریقہ تعلیم کا دارومدار صرف اسی بات پر تھا کہ سطحی معلومات حاصل ہو جائیں اور چند منتخب تقریروں کو حفظ کر لیا جائے اور دلائل کا مقابلہ لفاظی سے کرنے کی مہارت پیدا ہو جائے۔ اس تعلیم کی خصوصیت تدریس تھی اس کو تربیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔

سوفسطائیوں کے اثر کا یہ حال تھا کہ ایتھنز کے نوجوانوں نے حصول علم کے قدیم طریقہ کو جو گرامر اسکولوں اور جمناز یم کی تعلیم پر مشتمل تھا ترک کر دیا اور ان کو اس سے نفرت پیدا ہو گئی۔ سیاست کے میدان میں گوئے سبقت لے جانے اور امتیاز پیدا کرنے کے آرزومند ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کوئی سوفطائی صاحب گذرگاہ عام پر جلوہ افروز ہوتے تو ان کے گرد نوجوانوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ ایتھنز کے نوجوانوں میں یہ خواہش عام طور سے پیدا ہو گئی تھی کہ سوفسطائیوں سے مستفیض ہوں اور ان کے طرز استدلال اور بحث و مباحثہ کے طرز گفتگو کو اختیار کریں لیکن ان کے اثر کا نتیجہ بقول ارسطافنوس Aristophanes یہ مرتب ہوا کہ "ایتھنز کے نوجوان تنگ خیال اور زبان دراز ہو گئے"۔

حضرات سوفسطائیہ ہر بات میں دخل درمعقولات کے مرتکب ہوتے تھے انھوں نے ایتھنز کی روایات اور تہذیب و تمدن کو درہم برہم کر دیا۔ نکتہ چینی کرنے میں ان حضرات نے انہدام و انتشار کے اصول پر عمل کیا اور جو پرانی چیز برباد کی اس کی جگہ کوئی نئی بات قایم نہیں کی ان کا کام صرف نفی تھا یعنی ہر چیز کی بیخکنی کریں مگر کسی قسم کی مثبت یا تعمیری کام کرنے سے یہ لوگ ہمیشہ قاصر رہے۔ غرضکہ ہر بات کی مخالفت کرنا ان کا خاصہ طبعی ہو گیا تھا مگر اپنی شخصیت کے بچاؤ میں وہ مل کر آپس میں ایک ہو جاتے تھے۔

حضرات سوفسطائیہ نے ایتھنز کے روایات مخصوصہ اور تہذیب و تمدن کے انہدام و بربادی کا جو رجحان پیدا کر دیا تھا اس کی روک تھام کے لئے سقراط Socrates و افلاطون Plato و ارسطو Aristotle جیسے عقلائے دہر پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف سوفسطائیوں کے زہریلے

اثر کو نیست و نابود کیا بلکہ تعلیم کے صحیح اصول کی بنیاد قایم کی۔ اگر یونانی قوم میں سقراط پیدا نہوتا اور ہر موقعہ اور ہر محل پر حضرات سوفسطائیہ کی سطحی معلومات اور غیر منطقی دلائل کا مضحکہ اُڑا کر اُن کی قلعی نہ کھولتا تو ہرگز یونانیوں کو دنیا کے تہذیب و تمدن میں وہ درجہ اور رتبہ حاصل نہوتا جو انکو نصیب ہوا۔ اسوقت اہل یونان سنجیدہ دلیلوں اور سنجیدہ باتوں کے سننے کے لئے گویا گونگے اور بہرے ہوگئے تھے اور یہ زہریلا اثر صرف اس طریقہ سے دور ہوسکا کہ سقراط نے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے وہی طریقے برتے اور وہی ذرائع اختیار کئے جن کے ذریعہ سے حضرات سوفسطائیہ نے ان کو گمراہ کیا تھا۔

سقراط سقراط کی پیدایش ۴۶۹ھ (قبل مسیح) میں واقع ہوئی اور ۳۹۹ھ (ق م) میں اس کے ہموطنوں نے اس الزام کی پاداشں میں اس کو قتل کیا کہ ایتھنز کے نوجوانوں کے خیالات اپنی عجیب و غریب باتوں سے پراگندہ و خراب کرتا ہے۔

سقراط کو افلاطون و زنوفن Znophon دو شاگرد رشید ملے اور ان ہی دونوں نے اس کے طریقہ استدلال کو فروغ دیا۔ سقراط ایک طرف تو غلطیوں اور غلط خیالات کی بیخکنی کرتا ہے اور دوسری طرف وہ استفادۃً ایسے سوالات قایم کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے خاص طریقہ استدلال سے جس کو "سقراطی طریقہ استدلال" کہتے ہیں اپنے مخاطبین کو تناقض و تضاد کی بھول بھلیوں میں پھنسا دیتا ہے۔

سقراط کو علوم حقیقی کا موجد کہنا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ اسی نے صحیح غور و فکر کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اپنے مدمقابل حضرات سوفسطائیہ کی طرح مناظرہ کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کی غلطیوں پر اُن کو قائل معقول کیا اُن کی جہالت اور نادانی کی خوب قلعی کھولی اور ہر موقعہ اور ہر محل پر جاہل و عالم ادنیٰ و اعلیٰ سے مناظرہ کرکے انھیں مجبور کیا کہ صحیح خیالات قایم کریں اور سطحی معلومات چھوڑیں۔ سوفسطائیوں کے غلط اصول اور ان کی سطحی معلومات کی قلعی کھولنے سے سقراط نے اہل ایتھنز میں یہ مادہ پیدا کردیا تھا کہ وہ اس کے شاگرد افلاطون کے قایم کردہ اصول کو

قبول کر سکیں۔ خود افلاطوں کا قول ہے کہ ”ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ یہی خیال ہوتا ہے کہ ہم وہ جانتے ہیں جو حقیقت میں ہم نہیں جانتے۔ اپنی نادانی اور ذہنی پستی کا احساس ہی حقیقی علم کے حصول کے لئے بمنزلہ پہلے قدم کے ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ ترقی کے لئے اپنی پستی کا احساس نہایت ضروری ہے۔ سر سیّد علیہ الرحمۃ نے لارڈ ڈفرن کو جو ایڈریس دیا تھا اُس میں مُسلمانان ہند کی پستی اور تنزل کا تذکرہ کیا گیا تھا جس پر لارڈ موصوف نے کہا تھا کہ ”اب مجھکو اُمید ہوتی ہے کہ مسلمان ترقی کریں گے کیونکہ وہ اب اپنی حالت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔“ جو اشخاص ”مشرق“ اور ”مغرب“ کے سرداروں اور مسلمان کو ”سارے جہان“ اور ہفت اقلیم کا مالک قرار دے کر نفس کو اُبھارتے اور مسلمانوں کی قوم میں ”ہمچو من دیگرے نیست“ کا خیال پیدا کرتے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایسے خیالی مضامین کو پڑھ کر ایک خاص مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے مگر فی الحقیقت یہ خیالات ترقی کے لئے سدِراہ ہیں اور جب تک کسی قوم سے تفاخر بیجا دُور نہ ہوگا ترقی محال ہے۔

افلاطوں Plato

افلاطوں ایتھنز کے مشہور مقنن سولن کی نسل سے تھا اور اس کی پیدائش ۴۲۷ء قبل مسیح کی ہے۔ اس کی مشہور و معروف تصنیف ”ریپلک“ Republic (جمہوریت) پر اگرچہ دنیا کے مختلف علمانے مختلف پہلوؤں سے تنقید کی ہے اور اس پر ہر طرح سے موافق اور مخالف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مگر یہ امر واقعی ہے کہ فن تعلیم کو خاص علمی بنیاد پر قایم کرنے اور اُس کو ایک خاص فن قرار دینے میں یہی سب سے پہلے تصنیف ہے روسو Rousseau کا قول ہے کہ ”اگر تعلیم عامہ کا مفہوم تم معلوم کرنا چاہتے ہو تو افلاطوں کی کتاب ریپلک کا مطالعہ کرو۔“

افلاطوں نے جس جمہوری سلطنت کا خاکہ اپنی کتاب میں کھینچا ہے وہ تقریباً ناقابل عمل ہے اور شیخ چلی کے منصوبہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تعلیم کے بارہ میں اس کی رائے ہے کہ پیدایش

کے دن سے بچوں کو دایوں کے سپرد کرنا چاہیئے اور اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ کوئی ماں اپنے لخت جگر کو شناخت نہ کرنے پائے۔ اور جب بچّے چھ برس کے ہو جائیں تو اُن کو سرکاری مدارس میں داخل کر دیا جائے اور سلطنت کی طرف سے جو پیشہ اور جو کام جس لڑکے کے لئے معین ہو وہی کام او پیشہ اُس کو سکھایا جائے۔

افلاطوں نے حضرات شعرا پر خاص عنایت کی ہے۔ اور اُن کے لئے اپنی خیالی سلطنت میں کوئی جگہ نہیں رکھی۔ وہ اُن کو شہر بدر کر کے اگرچہ سرحد پار پہنچا دینا چاہتا ہی، مگر اتنی اُن کے ساتھ رعایت ضرور کرتا ہی کہ وہ جس قدر تیل چاہیں اپنے سروں میں ڈال لیں اور جس قدر پھولوں کے ہار چاہیں پہن لیں۔ قصّہ نویسوں کو بھی یہی قدغن ہے کہ بیہودہ قصّے اور کہانی نہ لکھیں اور دایوں کو مشورہ دیا ہی کہ عمدہ قصّے بچّوں کو سنائیں۔

افلاطوں نے اپنے فرضی شہر میں سکونت اختیار کرنے کا حق صرف توانا و تندرست اشخاص کو دیا ہی۔ اور کمزور مریض و ضعیف الجثہ لوگوں کے لئے اگرچہ اس نے صاف طور پر قتل عام کا فتویٰ تو نہیں دیا مگر تقریباً اس کے مرادف الفاظ میں وہ کہتا ہی کہ ”اُن لوگوں کو اُن کی اپنی حالت پر چھوڑ کر علٰحدہ ہو جاؤ“ یعنی مرنے دو۔ کیونکہ اُس کی رائے میں سلطنت کے مفاد کا یہی اقتضا ہی کہ جو اشخاص فرائض ملکی ادا کرنے پر بوجہ خرابی صحت قابلیت نہیں رکھتے اُن کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہی۔

سلطنت کے کاروبار کے لئے سیاست دان مُدبّرین کا انتخاب افلاطون مثل دیگر مشرقی ممالک کے مقتدایان مذہب میں سے نہیں کرنا چاہتا بلکہ فلسفیوں کو اس خدمت پر مامور کرتا ہی اور اس کی رائے ہی کہ تاوقتیکہ فیلسوف حضرات بادشاہ یا حاکم نہ بنائے جائیں اور سیاسی اقتدار اور فلسفہ ایک ہی ذات میں مجتمع نہو اُس وقت تک سلطنتوں کو اور نوع انسان کو عیوب و ذمایم سے نجات نہیں مل سکتی۔

تعلیم اُناث | افلاطون ہی دنیا میں پہلا شخص ہی جس نے عورتوں کی تعلیم کی حمایت کی ہے

اور مردوں کی طرح عورتوں کے لئے تعلیم کا اہتمام کیا ہے اور اس خصوص میں نہ صرف اپنے ہمعصروں بلکہ اپنے مابعد زمانہ میں بھی وہ بمدارج اعلیٰ خیالات رکھتا تھا۔ جس جوش اور مدلل طریقہ کے ساتھ تعلیم نسواں کی حمایت افلاطوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے شاید اب تک کسی نے نہیں کی۔ وہ کہتا ہے "انتظام سلطنت میں نہ تو کسی عورت کا محض اس بنیاد پر کہ وہ عورت ہے کسی علم یا کاروبار سے محروم رکھنا جائز ہے اور نہ کسی مرد کا محض اس لئے کہ وہ مرد ہے کسی علم و کاروبار کے کرنے کا کوئی حق ہے۔ خدا کی نعمتوں میں دونوں کو برابر کا حصہ ملا ہے اور دونوں کے حقوق مساوی ہیں۔ جن پیشوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ مردوں کے لئے مخصوص ہیں وہ سب کے سب عورتوں کے لئے بھی ہیں اور کسی قسم کی کوئی تفریق روا نہیں جس طرح مردوں میں کچھ آدمی مقابلتہً کمزور ہوتے ہیں اسی طریقہ سے عورتوں کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کسی قدر جسمانی حالت میں کمزور ہیں مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ ان پیشوں سے محروم کردی جائیں"۔

غلاموں اور پیشہ وروں کی تعلیم

افلاطوں چونکہ حکمران خاندان میں سے تھا اس لئے وہ حکومت کے جذبات کو مغلوب نہیں کرسکا۔ اُس نے غلامی کے رواج کو جائز رکھا ہے اور پیشہ وروں کے لئے جو اس کے ملک میں زیادہ تر غیر ممالک کے لوگ تھے تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔

اصول تعلیم

افلاطوں نے صحیح تعلیم کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "تعلیم وہ عمدہ خصلت ہے جو بچوں میں خوشی، غمی، محبت و نفرت کے خیالات کو جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں ضبط اور اعتدال کے ساتھ ظاہر کرنے کی قدرت پیدا کرے"۔ اس نے علم کو صرف علم کی غرض سے سیکھنے کا مشورہ دیا ہے اور جلب منفعت کا جو ملمع سوفسطائیوں نے چڑھایا تھا اُس کی اس نے خوب قلعی کھولی ہے۔ تعلیم کے بارے میں اس کے اصول اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہیں

۱۔ اس نے سقراط کے اس اصول کی تائید کی ہے کہ اپنی جہالت اور نادانی اور ناواقفیت کے

مضرتوں کا احساس ہی سچے اور صحیح علم کی بنیاد ہی۔
۲- علم کا نظام تمدن سے واسطہ اور تعلق ہے۔ اس لئے نتیجۂ یہ ضروری ہے کہ تمام تعلیمی اصول سیاسات اور مدنیت کے پہلو بہ پہلو قایم کئے جائیں۔ سیاسی حالت کا تعلیم پر ہمیشہ اثر ہوتا ہے۔
۳- ہر علم کے درس کا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ طالب علم کی تربیت اچھی ہو اور اُس کی تعلیم درست ہو علم سیکھنے سے غرض جلب منفعت ہو یعنی علم کو دماغی اور ذہنی تربیت کے لئے سیکھنا چاہیئے اور اس کے سیکھتے وقت سونا چاندی پیدا کرنے کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے[ل]۔
۴- جماعت اور اُس کے افراد میں جو باہمی تعلق ہے وہ افلاطوں کی رائے میں ایک تعلیمی مسئلہ ہی۔
۵- افلاطوں کا قول کہ تعلیم میں فنون لطیفہ مثل نقاشی، مصوری بھی سکھلانی چاہیئے اور یہ علوم و فنون ذہنی اور عملی تعلیم کے درمیان ربط قایم کرتے ہیں۔

ارسطو ARISTOTLE

ارسطو جسے ڈینٹ Dante تمام اہل علم کا اُستاد کہتا ہی، ایک طبیب کا بیٹا تھا ۳۸۴ء (قبل مسیح) میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر تک اس کی تعلیم ایتھنز میں ہوئی جہاں وہ افلاطوں کے مدرسہ میں تحصیل علم کرتا تھا۔ افلاطوں کی وفات کے چار سال بعد ارسطو سکندر اعظم کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس وقت سکندر تیرہ برس کا تھا۔ ارسطو تین سال تک اس عہدہ پر مامور رہا اس کے بعد وہ ایتھنز واپس آگیا اور Lyceum (لائی سیم) میں افلاطوں کی درسگاہ کے مقابلہ میں اپنا مدرسہ جاری کیا۔ سکندر اعظم کی وفات پر (۳۲۳ء قبل مسیح) مخالفین نے ارسطو کو ایتھنز چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ ایک ہی سال کے بعد فوت ہو گیا۔
ارسطو کے نزدیک تعلیم کا مقصد و منشا صرف ایک ہی ہے یعنی راحت۔ برخلاف

[ل] ہربرٹ اسپنسر کی رائے اس کے بالکل متضاد ہی اور صحیح طریقہ اس کے بین بین معلوم ہوتا ہی جس کا بیان آگے چل کر تشریح کے ساتھ آئے گا۔

افلاطون وسقراط کے جو علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنے کی موید اور طرفدار ہیں، ارسطو کہتا ہی کہ علم نیکی اور بھلائی کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہی۔ افلاطون کا قول ہے کہ علم کا کوئی صلہ نہیں ہونا چاہیئے لیکن ارسطو کے نزدیک علم کا صلہ قلب کی راحت ہی۔

ارسطو اہل اسپارٹا کو ہدایت کرتا ہی کہ "ہر کہ ومہ کے لئے ایک ہی قسم کا نصاب تعلیم مقرر کرو کیونکہ جب کہ تعلیم کی غایت ایک ہی تو تعلیم بھی یکساں ہونا چاہیئے اور اس کی ذمہ داری افراد پر نہیں بلکہ ملک پر ہو۔ سلطنت کا فرض ہی کہ تمام رعایا کی حقوق کی نگہداشت کرے۔"

ارسطو کے اصول کے مطابق تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہی جس پر ملک کے مفاد و مضرات مبنی ہیں اور اس لئے اس کو پرائیوٹ اشخاص کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اور وہ آگے چل کر یہ اضافہ کرتا ہی کہ صرف ان حکومتوں[ل] میں جہاں کے انتظامات ناقص ہوں اور تعلیم کے متعلق غفلت برتی جاتی ہو خاندان کے بزرگوں اور سرپرستوں کا فرض ہی کہ اپنی انفرادی کوششوں سے اس کمی کو پورا کریں اور تعلیم کا بطور خود انتظام کریں۔

بچوں کی تعلیم کے متعلق ارسطو کہتا ہی کہ زمانہ ولادت سے قبل ہی اس کی فکر ہونا چاہیئے اور بچوں کے قوائے جسمانی کے خیال سے وہ پہلے اصول ازدواج کو طے کرتا ہی یعنی یہ کہ شادی کس عمر میں کرنا چاہیئے اور کیسے لوگوں کو کرنا چاہیئے۔ بچوں کے لئے وہ تجویز کرتا ہی کہ ان کی غذا دودھ ہو اور جسم کو بہت بہت حرکت ملتی رہی بچوں کو زیادہ گرم نہیں رکھنا چاہیئے۔ پانچ برس کی عمر تک بچہ اس قابل نہیں ہوتا ہی کہ اس کو کسی قسم کی جبری ورزش پابندی کے ساتھ کرائی جائے اس بارے میں ارسطو کو افلاطون سے اتفاق ہی کہ کھیل میں بچے کو ان کاموں کی نقل کرنی چاہیئے جو اس کو بڑے ہو کر کرنا پڑیں گے۔ تعلیم کے اس اصول کو پستالوزی اور فردبیل نے بالتفصیل بیان کیا ہی۔ ارسطو کے نزدیک یہ غلطی ہی کہ بچوں کو رونے اور ہاتھ پیر مارنے سے روکا جاوے کیونکہ اس کے خیال میں اس سے نشو ونما میں مدد ملتی ہی۔ ارسطو خود بھی صاحب اولاد تھا اور وہ

[ل] دنیا کی سلطنتوں میں سے اکثر سلطنتیں ارسطو کے اصول کی پابند ہیں اور رعایا کی ہر قسم کی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔

اس کا طرفدار نہیں کہ بچے دایوں کے سپرد کر دیئے جاویں جیسا کہ افلاطوں نے تجویز کیا ہے (جس کے کوئی اولاد نہیں تھی)، وہ کہتا ہے کہ سات برس کی عمر تک بچے گھر پر رہیں اور جہاں تک ممکن ہو نوکروں چاکروں کے ہاتھ میں نہ چھوڑے جاویں۔ باقاعدہ تعلیم سات برس کی عمر سے شروع ہونی چاہیے اور مفصلہ ذیل مضامین سکھانے چاہئیں (۱) نوشت و خواند (۲) ورزش (۳) موسیقی (۴) نقشہ کشی۔ اس کے نزدیک جسم کی ترتیب دماغ کی تربیت سے مقدم ہے لہذا ورزش کرانا اور قواعد سکھانا اس عمر میں لازمی ہے اور ورزش جسمانی کو دیگر دماغی مضامین کے ساتھ ایک علیحدہ مضمون قرار دینا چاہیئے جس کی باقاعدہ تعلیم ہو۔ زمانہ بلوغت کے تین سال کے بعد تک سخت ورزشیں بچوں کو نہیں کرنی چاہئیں۔ ارسطو نے اپنی اس رائے کی تائید میں نہایت دلچسپ اعداد پیش کئے ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ وہ بچے جو جوانی کی حالت میں اولمپک[1] Olympic کھیلوں میں ممتاز رہتے ہیں وہ آگے چل کر ورزش کے کھیلوں میں گر جاتے ہیں اور وہ لوگ بڑھ جاتے ہیں جنھوں نے نوجوانی میں سخت ورزشیں نہیں کیں۔

یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا کہ بچوں کو ایک معیار سے زیادہ کھیل کھلانے سے ان کی آیندہ صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے یا برا۔ میں نے خود بھی اس مسئلہ پر کافی غور نہیں کیا ہے مگر سرسری نگاہ ڈالنے پر بھی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے کالج کے وہ طلبا جو کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کے اوّل ٹیم میں رہتے ہیں اُن کی جسمانی حالت کالج چھوڑنے کے بعد اور طلبا کے مقابلہ میں خاص طور پر ممتاز نہیں ہے اور اکثروں کو اس کے برعکس نتائج پیدا ہوئے ہیں۔

اہلِ روما ROMANS

پچھلے بیان سے ظاہر ہے کہ یونان میں تعلیم کے دو بالکل جداگانہ طریقے رائج تھے یعنی ایک تو وہ جو اسپارٹا میں رائج تھا وہ بالکل یک رخی اور جنگی تعلیم تھی اور اس میں قوائے ذہنی کی

[1] ایک قسم کے ورزشی کھیل جو قدیم یونان میں رائج تھے۔

تربیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرا وہ جو ایتھنز میں جاری تھا اور یہ ایک ایسا مکمل طریقہ تھا کہ اس میں جسم اور دماغ دونوں کے نشو و نما کا نہایت عمدگی کے ساتھ لحاظ رکھا گیا تھا۔

اہل روما نے اپنی سلطنت کے طولانی عہد میں ان دونوں طریقوں پر یکے بعد دیگری عمل کیا۔ سلطنت جمہوری کے زمانہ سے فتح یونان تک اسپارٹا کے طریقہ تعلیم کو ترجیح دی گئی اور شہنشاہی کے زمانہ میں ایتھنز کا طریقہ رائج ہو گیا۔ اوائل میں اہل روما کے یہاں مذہبی پیشوا ہی معلم ہوتے تھے اور تعلیم تقریباً تمام تر جسمانی اور اخلاقی بلکہ قومی اور مذہبی ہوتی تھی ان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل تھی۔ جسمانی ورزشیں، مذہبی گیت اور دوازدہ احکام (جو قانون آدم کہلاتے ہیں) کا مطالعہ۔

اس ملک نے جتنے شہ زور، نہایت شجاع، سخت پابند قانون اور غایت درجہ کے محبان وطن پیدا کئے وہ اسی قومی تعلیم کا نتیجہ تھے ان کی تعلیم کا مقصد محض جلب منفعت تھا اور اسے اُصول اخلاق سے کچھ سروکار نہ تھا۔

اہل روما کی خانگی زندگی یونانیوں کی خانگی زندگی پر بمدارج فوقیت رکھتی تھی، اس زمانہ کی عورتیں صنف نازک کا قابل قدر نمونہ تھیں۔ بیوی نہایت سلیقہ اور کفایت شعاری سے گھر کا انتظام کرتی اور یہ امر اس کی راحت قلبی کا موجب تھا کہ وہ اپنے بچوں کو بذات خود پرورش کرے۔ دلکش خودداری، مادرانہ محبت اور حسن خانہ داری ہی ان کی خوبیاں تھیں نہ کہ علم و فضل۔ فتح یونان کے بعد اہل روما کی سادگی میں ایک تغیر پیدا ہوا اور بقول ہوریس "مفتوح یونان نے فی الواقع اپنے فاتح کو تسخیر کر لیا"۔

علم دین کا مذاق تیسری صدی قبل مسیح کے اواخر میں پیدا ہو گیا تھا اور اہل روما یونانیوں کے اس طریقہ کا تتبع کرنے لگے کہ اپنے بچوں کو غلاموں کی نگرانی میں چھوڑ دیتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اہل روما نے تعلیم کو کبھی ایک ایسا کام نہیں تصور کیا جس کی ذمہ داری

قوم پر ہو اور سلطنت اس کا انتظام کرے۔ دوازدہ احکام میں بچوں کی تعلیم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

سات سال کی عمر میں بچّہ کو مدرسوں میں بھیجدیا جاتا تھا جن کو پرائیویٹ طور سے مختلف لوگوں نے قائم کیا تھا۔ ابتدائی مدارس کے مدرسین کی کچھ زیادہ عزت و وقعت نہیں کی جاتی تھی اور علی العموم یہ ایسے لوگ ہوتے تھے جو اور پیشوں میں ناکام اور نامراد رہی ہوں۔ ان لوگوں کو اپنی عمر میں مال و دولت حاصل کرنے کا صرف اس طرح موقعہ مل سکتا تھا کہ اگر قسمت نے یاوری کی تو کسی شاہزادے کی اتالیقی کی خدمت مل گئی۔ مگر اعلیٰ طبقہ کے لوگ مدرسین کی سرپرستی عام طور سے نہیں کرتے تھے۔

بچہ کی تعلیم نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم سے شروع ہوتی تھی۔ اور عام دستور تعلیم کا یہ تھا کہ حرف کی شکلیں اور صورتیں بتلانے سے پہلے اُن کے نام اور اُن کی ترتیب یاد کرائی جاتی تھی۔ حساب کی تعلیم میں Abacus[1] (ایک آلہ تعلیم حساب) کا استعمال بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔

طلبہ کے اداب کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا اور تنبیہ یہ تھی کہ طالب علم مدرسہ کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اوستاد کو نہایت تعظیم کے ساتھ سلام کرے اور مودب ہو کر بیٹھے۔

ابتدائی تعلیم بارہ برس کی عمر میں ختم ہوجاتی تھی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم شروع ہوتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم میں صرف و نحو، السنہ یونانی، شعر، معانی و بیاں کی تعلیم ہوتی اور اسی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کے اصول و قواعد، نظمیں اور فصیح و بلیغ تقریریں حفظ

---

[1] یہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے گنتی، جمع و تفریق سکھلائی جاتی تھی۔ اس آلہ میں لوہے کی سلائیں ہوتی ہیں، جن میں لٹو پروے ہوے ہوتے ہیں اور لٹوؤں کو ایک طرف سے دوسری طرف لے جاکر شمار کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

کرائی جاتی تھیں۔

کوئنٹلین QUINTILIAN

کوئنٹلین ملک اسپین میں تقریباً ۳۵ھ ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بچپن ہی میں اس کو شہر روما میں لے گیا اور وہاں اوس کو قانون کی تعلیم دلوائی۔ حصول تعلیم کے بعد کوئنٹلین نے اپنے وطن میں وکالت کا کام شروع کیا اور تھوڑے عرصہ تک وکالت کرنے کے بعد وہ پھر روما کو واپس چلا آیا۔ جہاں اُس نے اپنی زندگی کے بیس برس درس وتدریس کے مشغلہ میں گذارے۔ وہ پہلا معلم تھا جس کا سلطنت نے مشاہرہ مقرر کیا اور "پروفیسر خطابت" کا معزز خطاب عطا کیا۔ درس تدریس کا مشغلہ ترک کرنے پر اُس نے اپنی کتاب "اصول خطابت" شائع کی جس میں اس نے تعلیم کے اصول بیان کئے ہیں۔

کوئنٹلین کا یہ عقیدہ تھا کہ تعلیم بہت ابتدائی عمر سے شروع ہونا چاہئے کیونکہ جو باتیں بچپن میں سکھلا دی جاتی ہیں وہ دل نشین ہوجاتی ہیں اور بڑے ہو کر کام میں آتی ہیں۔ کوئنٹلین کے نزدیک بچہ کے لئے دایہ کا انتخاب احتیاط کے ساتھ کرنا چاہئے، وہ ایک نیک اور سمجھ دار عورت ہو، اس کی ضرورت نہیں کہ وہ عالمہ وفاضلہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی زبان نہایت صاف اور بے عیب ہو۔ بچہ کو پڑھنا لکھنا سکھانے میں پہلے حروف تہجی سکھلائے جائیں۔ لیکن اون کے ناموں اور ترتیب سے پہلے اُن کی صورتیں بتانی چاہئیں کیونکہ کوئنٹلین کے نزدیک یہ بالکل غلط طریقہ ہے کہ حرفوں کی صورتوں سے پہلے ان کے نام اور ترتیب سکھائی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ حروف ہاتھی دانت کے ہوں تو بہتر ہے کیونکہ بچوں کو اُنھیں ہاتھ میں لینے، دیکھنے اور نام لینے سے خوشی ہوتی ہے۔ لکھنا سکھلانے کے لئے کوئنٹلین کی رائے ہے کہ حروف کو لکڑی کی تختی پر کھدوالیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ تعلیم میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔ پڑھنا لکھنا

سیکھنے میں جس قدر نقصان جلد بازی سے ہوتا ہے اوس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کوئنٹلین جہاں اون باتوں سے منع کرتا ہے جو بچہ کے سکون خاطر اور امنگ میں رخنہ انداز ہوتی ہیں وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی اِس زمانہ کا معلم تقریر کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تعلیم کو بچّے کے لئے ایک کھیل بنا دو۔ سوال بنا بنا کر پوچھو۔ جب وہ اپنا اچھا کام کرے تو اُس کی تعریف کرو اور اگر وہ کوئی بات اپنے دل سے پیدا کرے تو اوس کا احساس اور واقفیت اُسے ہونے دو۔

کوئنٹلین پرائیویٹ طور پر تعلیم پانے اور مدارس میں پڑھنے کا باہمی مقابلہ کرتا ہی اور نہایت شدّ و مد کے ساتھ مدرسوں میں پڑھنے کی تائید کرتا ہے۔ وہ پہلے تو یہ دکھاتا ہی کہ مدرسے بچّوں کی اخلاقی خرابی کے اس سے زیادہ موجب نہیں ہوتے جتنا ہم خود ہوتے ہیں اُس کے الفاظ یہ ہیں "کیا ہم خود ہی اپنے بچوں کے اخلاق و عادات نہیں بگاڑتے؟ ہم نے ناز و نعم کے ساتھ پرورش کرکے اُن کے جسم کمزور کردیے۔ ہم نے اون کی تربیت میں تساہل کیا جس کا نام لاڈ اور پیار رکھا ہے اور بچے کے ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کے قوی کمزور کردیے۔ اگر اس نے کوئی بے حیائی کی بات کہی تو ہم خوش ہوئے، اور وہ لفظ جو شرفا میں روا نہیں رکھے جاتے جب اُس کی زبان سے نکلے تو ہم مسکرا دیے اور اوس کا مُنہ چوم لیا" اس کے بعد وہ نوکروں میں اُٹھنے بیٹھنے سے بتاکید منع کرتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مدرسوں کو پرائیوٹ تعلیم پر ترجیح دینی چاہیئے کیونکہ علاوہ اس کے وہ ان خطرات سے مبرّا ہوتے ہیں، مدرسہ میں بچّوں کو صحبت، رفاقت اور مقابلہ کی وجہ سے تحریک پیدا ہوتی ہے۔

میری رائے میں کوئنٹلین نے مدرسوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے کوئنٹلین کہتا ہے کہ اوستاد بجائے ماں باپ کے ہے اور بچّوں کی تعلیم کا ذمہ دار ہی اس کا یہ فرض ہے کہ ہر بچّہ کی خاص طبیعت کا خیال رکھے تعلیم کی غایت اخلاق فاضلہ ہی

لہذا ضروری ہے کہ اوستاد بچوں سے میل جول رکھے اور اسی غرض سے وہ تجویز کرتا ہے کہ کھیل اور تفریح میں اوستاد بچوں کا شریک ہو۔ سزائے جسمانی کو قطعاً موقوف کردینا چاہیئے اور اوس کو کام بچہ کی غیرت اور اوستاد کے اثر سے لینا چاہیئے۔

نصاب تعلیم میں کوئنٹلین نے موسیقی کو ترک نہیں کیا۔ اوس کی رائے میں موسیقی سے واقفیت ضروری ہے تاکہ نظم میں وزن اور قافیہ کا احساس پیدا ہوجائے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ بچے کسی ورزش گاہ میں بھی شریک ہوا کریں تاکہ ورزش جسمانی سے اُن کے قوائے جسمانی کا نشو و نما بھی ہوتا رہے۔

پلوٹارک Plutarch

پلوٹارک سنہ ۴۶ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۲۵ء میں وفات پائی۔ یہ قدیم زمانہ کا ایک بہت بڑا معلّم، مورّخ اور حکیم گذرا ہے۔ اوس کی تعلیم ایتھنز میں ہوئی اور وہ روما میں فلسفہ اخلاق پڑھا کرتا تھا۔ اس کی کتاب موسوم بہ "حیات مشاہیر" بے انتہا علم و فضل تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے۔ اسی کتاب پر مدّت دراز تک روما میں خانگی اور مدرسہ کی تعلیم کی بنیاد قائم تھی اور شیکسپیر ملٹن اور اس زمانہ کے بعض اور مصنفین کی بڑی بڑی تصانیف کا یہی کتاب ماخذ ہے۔ ہنری چہارم نے اوس کتاب کی نسبت یہ کہا ہے کہ "یہ کتاب مجھے ضمیر اور ایمان کا کام دیتی ہے۔ اوس نے بہت سے نیک مشورے اور عمدہ مقولے میری ذاتی اصلاح اور ملکی نظم و نسق کے متعلق وقتاً فوقتاً چپکے سے میرے کان میں پھونکے ہیں"۔

پلوٹارک خاندانی تعلیم کا بہت بڑا موید ہے۔ قدیم جمہوریت کے مٹ جانے کے بعد پلوٹارک نے ترقی کا مرکز خاندان کو قرار دیا ہے وہ کہتا ہے کہ تعلیم خانگی اور انفرادی ہونی چاہیئے۔ وہ مدرسوں کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتا مگر اعلیٰ تعلیم کے لئے۔ پس اس امر میں وہ کوئنٹلین سے متفق نہیں ہے۔

شعرا کے حق میں پلوٹارک نے بہ نسبت افلاطون کے زیادہ انصاف سے کام لیا ہے۔ وہ اس کے خلاف نہیں کہ شعرا کا کلام نہ پڑھا یا جاے بلکہ فقط یہ کہتا ہے کہ بے امتیاز نہیں پڑھنا چاہیے۔ صرف اون شعرا کا کلام پڑھنا چاہیے جن کے کلام سے لطف شعر کے ساتھ اخلاق صالحہ کی تعلیم بھی ملے۔

تعلیم کے باب میں جو مقام وہ خاندان کو دیتا ہے اوس کا ایک نیتجہ یہ ہے کہ اس سے فرقہ اُناث کی مادی اور اخلاقی حیثیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ عورت کو مالی امداد اور بچوں کی تعلیم و تربیت دونوں میں خاوند کا شریک قرار دیتا ہے اُس کے نزدیک ماں کو چاہیئے کہ وہ بچوں کی تعلیم میں ہاتھ بٹائے۔ لہذا لازم ہے کہ خود بھی تعلیم یافتہ ہو۔ مگر اس بارے میں وہ عورت کی فطری صفات پر بہ نسبت تحصیل علوم کے زیادہ زور دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "عورتوں کی صحبت سے اُن کی بھولی صورت، اُن کی شیریں کلامی اُن کی محبت اور اُن کی حسّاس طبیعت کی بدولت دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے"

اہل عرب

اس امر کے متعلق معلوم کرنے کے لئے کہ مسئلہ تعلیم کی نسبت اہل عرب کے کیا خیالات تھے بہت کم مواد موجود ہے۔ تعلیم کی تاریخ پر اہل یورپ میں جن لوگوں نے تصانیف کی ہیں اگرچہ وہ اپنی تصانیف میں اوائل زمانہ کے حالات درج کرتے ہیں لیکن اہل عرب کے زمانہ کو قطعاً چھوڑ جاتے ہیں غالباً اس کا سبب اُن کی ناواقفیت ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جب یورپ میں احیاے علوم ہوا تو اہل یورپ نے سب سے پہلے عربوں ہی سے علوم حاصل کئے اور اپنی یونیورسٹیاں ہسپانیہ، مصر، بغداد، نیشاپور وغیرہ کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر بنائیں لہذا لازم ہے کہ اہل عرب میں مسئلہ تاریخ پر غور کرنے کے لئے ہم علماے مشرق اور اصل عربی تصانیف کی طرف رجوع کریں۔ (باقی دارد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کانفرنس گزٹ

حصہ سوم

سائنس یا علوم جدیدہ

آنریری ایڈیٹر

پروفیسر فیروز دین مراد بی اے، ایم ایس سی

فہرست مضامین

گھر کی مکھی، انسان کی قاتل

فصل (۲)

مکھی کے حالات

مکھی کی قے اور فضلہ مندرجہ بالا مضمون کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مکھی کے جسم کا بیرونی حصہ سرتاپا جراثیم سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا معدہ اور اندرونی حصہ بھی بیرونی حصہ جسم کی طرح ان سے مملو ہوتا ہے۔ مکھی فطرتاً کچھ ایسی حریص اور پیٹو واقع ہوئی ہے کہ کھانے سے کسی طرح اس کا جی سیر نہیں ہوتا۔ اس پر میلان طبع دیکھو تو مکروہ سے مکروہ اور غلیظ سے غلیظ اشیاء اس کی مرغوب اور پسندتر غذائیں ہیں اور عموماً ان اشیاء میں مختلف امراض کے جراثیم ہوتے ہیں جن پر اس کے معدہ کے عمل اور حرارت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے عرق معدہ کا اثر تو صرف ان ہی اجزا پر ہوتا ہے جو نباتاتی ہوتے ہیں اور جن میں غذائیت ہوتی ہے اور وہی گھل مل کر اس کے جزو بدن ہو جاتے ہیں۔ باقی جراثیم جوں کے توں صحیح سالم اُس کی نجاست کے ساتھ معدہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے گھر یا دکانوں کی جن اشیاء پر مکھیوں کی غلاظت ہو ان سے اجتناب بیحد ضروری ہے کیونکہ غلاظت میں جراثیم کا ہجوم ہوتا ہے۔ گھروں میں غلاظت سے بچنے کا کافی بندوبست ہونا چاہیئے تاکہ اس کے فضلہ کے نشانات کھانے پینے اور برتنے کے سامان پر آنے ہی نہ پائیں۔ بازاروں میں اس کا انسداد اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ جن دکانوں میں مکھیاں بھنبھناتی ہوں اور دکانداروں کو صفائی کا خیال

اور مکھیوں سے سامان کے حفاظت کی فکر ہو وہاں کی خرید و فروخت یک لخت بند کر دیں۔ یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہئیے کہ مکھیوں کی غلاظت کے خشک ہونے کے بعد کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ ان میں جراثیم جو ہوتے ہیں وہ اُس کے خشک ہونے پر بھی زندہ ہوتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ فی الوقت ہمارے حق میں کوئی زہر نہیں اُگل سکتے۔ موقع کے منتظر رہتے ہیں ذراسی رطوبت پہنچی اور اُنہوں نے زور باندھا۔ رہا ان کی نجاست اور غلاظت سے نجات ملے تو جب تک مکھیاں گھر میں ہوں گی یہ بات قطعاً ناممکن ہے۔ اس غلاظت کے علاوہ مکھیاں چونکہ فطرتاً حریص ہوتی ہیں جب کبھی انھیں موقع ملتا ہے ایک دوسرے کی سبقت کے خیال سے ٹھونس ٹھونس کر ضرورت سے زیادہ نہایت عجلت سے کھا جاتی ہیں اور ہمارے گھروں میں کھانے پینے کی اشیاء پر بیٹھ کر بڑے اطمینان سے تھوڑا تھوڑا اُگلتی جاتی ہیں اور دوبارہ چبا چبا کر کھاتی ہیں۔ تاہم تھوڑا بہت اُگلا ہوا رہ ہی جاتا ہے جس میں سیکڑوں ہزاروں امراض کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر اشیاء جن پر مکھیاں بیٹھتی ہیں چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے دو طرح کے نشانات پائے جاتے ہیں جن میں بڑے تو ان کی نجاست کے ہیں اور دوسرے اس اُگلی ہوئی چیز کا جو پسماندہ ہوتا ہے اُس کے۔ غرض ان دونوں طریقوں سے جراثیم کا انبوہ کثیر ہماری اشیاء خوردنی تک منتقل ہوتا ہے مگر ان باتوں کو جانے کون؟ اور نہ جاننے ہی کی وجہ ہے کہ بسا اوقات نادانستگی کے عالم میں ہم خود اپنے ہاتوں اپنی پاؤں پر کلہاڑی مارتے اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور نقصان بھی ایسا زبردست کہ اس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں۔ ماں باپ اپنی چہیتی اولاد کو کس لاڈ اور پیار اور ناز و نعم میں پرورش کرتے ہیں اور اُن کے آرام و راحت کے لئے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ ذرا سے دُکھ درد میں وہ مبتلا ہوں تو جان سے بھی دریغ نہیں کرتے

مگر اس کا کبھی دھیان بھی نہیں کرتے کہ خود ماں باپ کی لاپروائی اور غفلت سے ان کی جان عذاب میں پڑ جاتی ہے۔ علاج تو پہلے اس غفلت کا ہونا چاہیئے بچوں کو تو رہنے دیجیئے الگ خود کمانے دھمانے والے پر کوئی مصیبت آجائے تو گھر کا کیا حال ہو۔ یہ کوئی ان ہونی باتیں نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے اور ان ہی کی نادانیوں سے ہوتا ہے اب رہا اس کے لئے کوئی تدبیر۔ سو کوئی غیبی فرشتہ کان میں آکر کہنے سے رہا۔ جوئندہ یابندہ مثل مشہور ہے۔ جس کے پیٹ میں درد ہو وہی دوا کھائے۔ علم کا دروازہ کسی پر بند نہیں۔ ہر شخص کا فریضہ ہے کہ دروازہ کھٹکھٹائے اور اپنے اپنے بھائی بندوں کے لئے معلومات کا کافی ذخیرہ جمع کرے اور عمل پیرا ہو ورنہ نادانی کے عالم میں کوئی ناشدنی بات ہو جاوے تو خون اس کی گردن پر رہے گا کیونکہ نہ جاننا اس کی غلطی تھی۔

خیر اس تمام بحث کا مطلب یہ ہے کہ گھریلو مکھیاں سرتاسر جراثیم میں بھری ہوتی ہیں۔ جو ان کے بیرونی حصۂ جسم پر ہوتے ہیں وہ تو براہ راست یا کھانوں وغیرہ کے توسط سے ہم کو امراض میں مبتلا کرتے ہیں اور جو اندرونی حصۂ جسم میں ہوتے ہیں وہ ان کی غلاظت وغیرہ کے ذریعہ خطرہ کا باعث ہوتے ہیں۔

۱۷ ء صدی میں مکھی کے شر سے آگہی

گو سترویں صدی عیسوی میں جراثیم اور اُن سے امراض کا پیدا ہونا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا لیکن بلا شائبۂ شک سڈنہم اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ موسم گرما میں مکھیوں کی کثرت ایک شگون بد اور امراض کی کثرت کا پیش خیمہ ہے۔ آجکل خود ہمارا تجربہ بھی اس کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ عوام اس کو دھوپ کی شدت اور گرمی کی حدت کا نتیجہ تصور کرتے ہیں جو اگر صحیح ہو سکتا ہے تو اس اعتبار سے کہ ان اسباب میں مکھیوں کی تعداد غیر معمولی طور سے بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے

امراض آناً فاناً اس طرح پھیلتے ہیں جیسے بن میں آگ لگی۔

جاپان کے اطبا کا خیال

جاپان کے اطبا بہت پہلے اس کی کنہ کو پہنچ چکے تھے چنانچہ اُنھوں نے جنگ روس وجاپان کے موقع پر مکھیوں کے انسداد میں بہت کوششیں کیں اور ایک حد تک امراض کی روک تھام کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔

مکھی ماکولات ومشروبات میں گر پڑنے کے بعد ان سے احتراز لازمی ہے۔

غرض آج کل کے زمانہ میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ مکھیوں پر صدہا تو کیا لاکھوں جراثیم ہوتے ہیں ایک بھری ہوئے دودھ کے پیالہ میں مکھی کے ذریعہ امراض کے لاکھوں جراثیم کا پہنچ جانا بہت ممکن اور قرین قیاس بات ہے۔ جب تک کم ازکم پانچ دس منٹ میں دودھ کو خوب جوش نہ دیا جائے ان جراثیم کا مرنا محال ہے۔ مگر انسانوں کی لاپرداہی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اکثر دیکھا ہوگا کہ کھاتے پیتے وقت سالن دودھ یا چاء وغیرہ میں مکھی گر پڑتی ہے تو بڑی بے تکلفی سے نکال کر پھینک دی جاتی ہے اور ذرا بھی اندیشہ نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ نہ معلوم کتنے امراض کے جراثیم اس مکھی سے لپٹے ہوئے تھے جو ہمارے دودھ اور چاء میں مل گئے اور ان کے ساتھ ہمارے معدہ میں داخل ہوگئے۔ شکر تو اس کا ہے کہ صحت کی حالت میں جو عرق معدہ غذا پر گرتا رہتا ہے تریاق کا کام کرتا ہے ورنہ مدت ہوئی ہوتی کہ ان امراض کے جراثیم نے انسانوں کا خاتمہ کردیا ہوتا۔

تپ لازم

کس کو معلوم نہیں کہ تپ لازم نہایت زہریلا اور متعدی بخار ہے عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ مرطوب آب وہوا کی بود وباش اور صفائی کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے سے اس عارضہ میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ اس

میں شک نہیں کہ ان امور سے بتدریج صحت پر برا اثر پڑتا جاتا ہے اور طبیعت میں مرض کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی جاتی ہے مگر اصلی سبب یہ امور نہیں ہوتے متعدی بیماریاں امراض کے جراثیم کے منتقل ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور جراثیم منتقل ہوتے ہیں انہیں مکھیوں کے ذریعہ۔ بہت ممکن ہے کہ نادانی سے یہ کہا جائے کہ امراض کا متعدی ہونا اور جراثیم کا مریض سے تندرست آدمی کے جسم میں منتقل ہونا سب خیالی تکے اور محض لاطایل باتیں ہیں کیونکہ بہت سے لوگوں کو تپ لازم کے مریض کے نزدیک رات دن رہتے دیکھا ہے مگر ان پر اس مرض متعدی کا کوئی اثر نہیں پڑا تو اصل یہ ہے کہ مختلف انسانوں میں امراض کے مدافعۃ کی قوتیں مختلف درجوں کی ہوتی ہیں اس لئے سب پر یکساں اثر ہونا لازمی نہیں۔ بعض تو اس کے لپیٹ میں ایسے آتے ہیں کہ جاں بر نہیں ہوتے۔ اور بعض تھوڑی بہت مصیبت جھیل لیتے ہیں مگر آخر کار مرض کو دھکا دے کر بڑھا دیتے ہیں اور بعض خوش قسمت خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ایک تپ لازم تو کیا اُس کے ہفتاد پشت بھی آئیں تو اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ گو مرض کا اثر ان پر نہو اس کے جراثیم ان کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی رہتی ہے جو اُن کے لئے تو نہیں مگر دوسروں کے لئے خطرہ کا موجب ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے جسم میں جو مرض کے جراثیم موجود ہوتے ہیں وہ دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔

مرض کی فوری تشخیص دشوار ہے

اس کے علاوہ مریض کو کئی کئی دنوں تک مطلق خبر نہیں ہوتی اور مرض ہے کہ اس کے جسم میں خفیہ خفیہ اپنا تسلط جماتا جاتا ہے۔ مرض کی علامات کا فوری ظاہر ہونا کوئی ضروری امر نہیں۔ جراثیم کے توالد اور تناسل، زیادتی اور زہریلا اثر پیدا کرنے کی قابلیت کے لئے بھی آخر مہلت چاہیئے۔ اور اس مہلت میں عموماً مرض کی تشخیص

اور تعین پوری طور سے نہیں ہو سکتی اور جب تک مرض کی تشخیص ہی نہو دوسروں کو کیا خبر کہ کون بلا کس کے گلے لپٹی ہے۔ اس کے ماسوا مریض اچھا بھی ہو جاتا ہے تو جراثیم ایک دم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے بلکہ کئی دنوں تک خود اُس کے جسم میں موجود ہوتے اور منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ عام طور پر لوگ مریض کو غسل صحت دیکر سمجھتے ہیں کہ چلو کُل بلا ٹلی اب کوئی ڈر کی بات نہیں حالانکہ جراثیم کا پوری طور سے دفعیہ نہیں ہوا اور اس سے دوسرے تندرست آدمیوں کے جسم میں اُن کے منتقل ہونے کا احتمال باقی ہے۔

تپ لازم سے بچنے کی تدبیر

غرض ان مختلف مخدوش حالتوں میں اگر مرض سے دوسروں کو پناہ مل سکتی ہے تو صرف اسی طریقہ سے کہ رہنے بسنے کے مقام صاف ستھرے رہیں اور مکھیوں کا عمل دخل قطعاً نہو۔ مکھیاں نہ ہوں گی تو جراثیم میں پَر نہیں پھوٹ پڑیں گے جو مریض سے نکل کر تندرست آدمیوں سے آلپٹیں۔ آفت تو آتی ہے اسی گھر کی مکھی کی کارستانی سے کہ مریض کے گرد و نواح کی متاثر اشیاء میں ہو کر ہم کو متاثر کرتی ہے اور ہماری جان جنجال میں ڈالدیتی ہے۔ یہ نہو تو انسانوں کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا نہو۔

مکھی کی دوڑ دھوپ اور وبائی امراض کا شیوع

اس تمام تفصیلی وضاحت کے بعد بھی بہت ممکن ہے کہ لوگ مکھیوں سے امراض کے شایع ہونے کو بخوبی نہ سمجھیں کیونکہ ان کے خیال میں تو مکھیوں کی تگ و دو زیادہ سے زیادہ ایک گھر سے دوسرے گھر تک ہوتی ہے اور وبائی امراض گھر اور محلہ کا ذکر کیا ہے شہر بھر میں پھیل جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مکھیاں عوام کے خیال کے مطابق ایک محدود دائرے میں نہیں رہتیں۔ ہوا زور سے چلے تو اُن کے پر پرواز میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ دو دو تین تین میل بے تکان نکل جاتی ہیں اور یوں بھی ایک میل سے زیادہ فاصلہ

تک معمولی اوقات میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے بارہا تجربے ہو چکے ہیں مثلاً بہت سی مکھیاں ایک جگہ پکڑی گئیں اور انھیں رنگ کر چھوڑ دیا۔ پھر دو ایک دن کے بعد شہر کے مختلف محلوں میں مکھیاں پکڑی گئیں اور ایک ایسے رنگ میں انھیں ڈبویا کہ اگر کوئی مکھی ایک دفعہ پہلے رنگ میں رنگی جا چکی ہے تو پہلا رنگ اس رنگ سے مل کر معاً آسمانی ہو جاوے ورنہ یہی رنگ چڑھا رہے۔ اس سے صاف صریح طور پر پتہ چل گیا کہ مکھیاں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے مقامات اور شہروں میں سواریوں اور جانوروں کے ہمراہ مکھیوں کو دور دور جاتے ہوئے ہم خود روزانہ دیکھتے ہیں۔ پس ان کے ساتھ امراض کے جراثیم کو بھی دور دور تک دھاوا مارنے کا موقع ملتا ہے۔

انسان کا تمدنی اور معاشرتی فریضہ

تمدنی اور معاشرتی حیثیت سے ہمارا فرض منصبی ہے کہ مکھیوں سے چشم پوشی نکریں کیونکہ ان سے چشم پوشی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ در پردہ ہم دوسروں کو امراض سے متاثر کرتے اور درد دکھ میں مبتلا کرتے ہیں۔ ان پر ترس کھانا اور اُن کے فتنہ و شر سے غافل رہنا خود اپنی جان، اپنے بال بچوں، بھائی بندوں اور پڑوسیوں پر ستم ڈھانا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ انسان نادانی اور غفلت کے عالم میں وہاں بیدریغ گھس پڑتا ہے جہاں فرشتوں کے پَر جلتے ہیں مگر یہ ایک جہالت کا خاصہ اور لوازمہ ہے اس لئے اس کو شجاعت نہیں کہتے بلکہ تہور کہتے ہیں۔ اب جب کہ ارتقاء عالم میں سیکڑوں انقلابات آ چکے اور دنیا نے ہزاروں پلٹے کھائے نہ زمانہ جاہلیت ہی رہا اور نہ تہور کی ضرورت۔ علوم و فنون کی روشنی نے ہماری بصارت کو زیادہ تیز کر دیا ہے اور دنیا کے بہت سے راز فاش کر دیے۔ اب بھی ہم نے اگر ان سے فائدہ نہ اٹھایا اور پرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے رہیں تو ہماری زندگی باعث ننگ ہوگی اور

ہماری فہم و فراست بجاے تمغۂ امتیاز ہونے کے کلنگ کا ٹیکہ ہوکر ماتھے پر لگے گی۔

امریکہ اور افریقہ میں تپ لازم اور ہیضہ کے شیوع کا سبب مکھی قرار پائی

امریکہ میں جب تپ لازم پھوٹ پڑا اور لوگ پریشان ہوے تو ڈاکٹروں نے اس کے شیوع کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جن گھروں میں طبی مشوروں پر عمل کیا گیا تھا اور مکھیاں نیست و نابود کردی گئی تھیں وہاں گھر کے بقیہ افراد مرض سے مامون و محفوظ رہے اور جن گھروں میں اور سب ہدایات کی تو لفظاً لفظاً پابندی کی گئی لیکن مکھیوں کو آزاد رہنے دیا وہاں کئی کئی نفوس مرض میں مبتلا ہوے۔ جنوبی افریقہ میں ہیضہ اور سوء ہضم کی شکایت بھی عموماً ہوتی ہے جس سے خصوصاً صغر سنوں پر بحد مصیبت آتی ہے۔ وہاں بھی تحقیق و تفحص کا نتیجہ یہی ہوا کہ مکھیاں ہی مرض کے منتقل ہونے کا باعث قرار پائیں اور ان کا وجود امراض کے شیوع کے لئے لازم و ملزوم تسلیم کیا گیا جب مختلف اور متعدد تحقیقات اور تجربوں سے یہ معلوم ہوجاے کہ اکثر و بیشتر امراض کا سبب مختلف قسم کے غیر مرئی جراثیم ہیں اور جراثیم انسانوں تک منتقل ہوتے ہیں انھیں مکھیوں کے ذریعہ تو پھر یہ ہماری غفلت اور نادانی ہے جو ہم ان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ ہمیں چاہئے تو یہ کہ ہمیشہ مکھیوں کی ہلاکت کے درپے رہیں ورنہ اپنی اور اپنے عزیز و اقربا اور ہمسایوں کی صحت اور بقاے زندگی کو خیرباد کہیں۔

فصل (۳)

کارخانہ قدرت پر سرسری نظر

دنیا تنازع للبقا کی جگہہ ہے۔

اگر صحیفہ فطرت کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جاے تو صاف نظر آئیگا کہ اس رزم گاہ عالم میں ہر ہستی خواہ وہ حیوانات سے ہو خواہ

نباتات کی قسم سے اپنے اور اپنی نوع کے برقرار رکھنے بلکہ ان کے ازدیاد کے لئے سرگرم پیکار ہے۔ اور اسی باہمی جد وجہد کا نتیجہ ہے کہ ہر ہستی، نوع، اور جنس بتدریج ارتقائی مرحلوں کو طے کرتی رہتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی قوانین قدرت کچھ ایسے منضبط اور مکمل ہیں کہ کسی نوع اور جنس کو حد اعتدال سے تجاوز کرنے کا موقع بھی نہیں کیونکہ اعتدال کے برقرار رکھنے کے لئے اسباب مخالف بھی مہیا کئے گئے ہیں ورنہ اس اعتدال میں فرق پڑ جائے تو شیرازۂ قدرت بکھر جاسے۔

انسان کا ورود اور مکھی کے دشمنوں کی تباہی

جب حضرت انسان خلیفہ بن کر نازل ہوئے تو اُنہوں نے ہر جگہہ دخل دینا شروع کیا اور اُن کو پڑ گئی اس کی کہ ہر چیز اپنے ڈھب کی اور ہر کام اپنی مرضی کے موافق ہو۔ بس "ورائے روشنی طبع تو بر من بلا شدی" کا مضمون ہو گیا کہ بسا اوقات اپنے مطالب اور مقاصد کی تکمیل کے یہ ایسے پیچھے پڑے کہ کسی اور بات کا مطلق خیال نہ رہا۔ آگا پیچھا کچھ نہ سجھائی دیا تو لگے بہت سی مخلوق اور ہستیوں کو تباہ کرنے یہ سمجھکر کہ یہ مضر اور خوفناک ہیں حالانکہ وہی ان کے لئے ازحد مفید تھے۔ یہ محض ان کی کم سمجھی اور نادانی تھی کہ دوست دشمن کی تمیز نہ کی۔ یا کبھی محض آرایش وزیبایش کے خیال نے اُکسایا تو بہت سی ایسی ہستیاں اُن کے ہاتوں پامال ہوئیں کہ اگر بچ رہتیں تو اُن کے دشمنوں کی تباہی میں ان سے بہت کچھ اعانت ملتی۔ غرض ان کو لغزشیں ہوئیں اور طرہ یہ کہ ایک زمانہ تک ٹھوکریں کھاتے رہے تب بھی سنبھلنے کا خیال نہ آیا۔

مکھی کے دشمنوں کی حفاظت ضروری ہے

ان لغزشوں سے بچنے اور اپنے دشمن مکھیوں کو تباہ کرنے کے لئے ہمیں ان کیڑے مکوڑوں پتنگوں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تلاش اور پہچان لازمی ہے جو ان خوفناک جراثیم کے معین ومددگار مکھی کے قدرتی طور پر دشمن ہوں۔ اور نہ صرف

ان کی جان بچانا کافی ہے بلکہ عقل سلیم کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ان جانوروں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی ان معلومات سے اپنی اولاد کو آگاہ کریں تاکہ از سرنو تحقیق و جستجو میں ان کا وقت رائگاں نہ ہونے پائے۔ اس کے لیئے بہتر صورت یہ ہے کہ اس قسم کی معلومات کا ذخیرہ نصاب تعلیم میں شامل کر دیا جائے کیونکہ سب بچوں کے ماں باپ تو ان باتوں کو نہیں جانتے اور بعض جانتے بھی ہیں تو انھیں رات دن کی جھک جھک بک بک سے اتنی فرصت کہاں کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ کریں۔ وہ تو اولاد کو اُستاد اور معلم کے حوالے کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ چلو ایک اہم فریضہ سے سبکدوش ہوئے۔ غرض نصاب تعلیم میں ان کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ قوم اور ملک کے ہونہاران سے مستفیض ہوں اور آئے دن کے مصائب و آلام سے محفوظ رہیں۔

مکھی کے دشمن جانوروں کا ذکر

اب ان مکھیوں کے دشمنوں کی تلاش کرو تو ایک تو گگرموتا ملیگا کہ مکھی اس پر بیٹھ کر اُس کے زہریلے اثرات سے متاثر ہوتی ہی اور سُست پڑ جاتی ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد مر جاتی ہے۔ خدا کی قدرت ہے گرما میں مکھیوں کی کثرت ہوتی ہے تو اُس کی بھی کثرت ہوتی ہے مصلحت اس میں یہی ہوگی کہ ایک معینہ تعداد سے مکھیاں بڑھنے نہ پائیں مکڑی بھی جب دیکھئے اپنا جال بچھا کر ہمیشہ مکھیوں کی گھات میں لگی رہتی ہے مگر یہ کوئی زیادہ ہمارے کارآمد نہیں کیونکہ اگر اس کو گھروں میں پوری آزادی مل جائے تو اس میں شک نہیں کہ بہت سی مکھیوں سے نجات تو ملے گی لیکن اس کے ساتھ ہی گھر میں جالوں کا طومار ہو جائے گا۔ جس سے گھر کی زیب و زینت اور رونق جاتی رہتی ہے اور اس کو صفائی پسند طبیعتیں گوارا نہیں کر سکتیں۔ لیکن گھر کے باہر باغیچوں وغیرہ میں مکڑیوں کے مانع و مزاحم ہونا سخت غلطی اور نادانی ہے۔ اِس

ایک مکڑی کے سوا اور قسم کی مکڑیاں بھی ہوتی ہیں جو مکھیوں کا شکار تو کرتی ہیں مگر گھر کو بے رونق بھی نہیں ہونے دیتیں۔ مکھی کے علاوہ یہ اور بہت سے حشرات الارض کو کھا لیتی ہیں جو انسانوں کے حق میں مضر ہوتے ہیں۔ اس لئے اِن مکڑیوں کی قدر کرنی چاہیئے۔ مکھیوں کے انڈوں اور کرم کو کنکھجورے، گبریلے، اور چیونٹیاں بھی کھا جاتی ہیں چھپکلی اور گرگٹ بھی مکھیوں کے دشمن ہیں اور مکھیوں کا خوب شکار کرتے ہیں۔ گرگٹ تو معلوم ہوتا ہے کہ محض اسی کام کے لئے دراز زبان اور کشادہ دہن بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں جانور نہ تو زہریلے ہیں اور نہ ہمیں کسی قسم کی تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مکھیوں کے دشمن ہونے کی حیثیت سے ان کی حفاظت کرنا اور ان کو امان دینا ہمارا فریضہ ہے۔

مکھی کے دشمن پرندوں کا ذکر

پرندے عموماً مکھیوں کے دشمن ہوتے ہیں اور تو اور ایک اور قسم کی مکھی ہوتی ہے۔ جو معمولی مکھیوں سے کسی قدر چھوٹی ہوتی ہے یہ ان معمولی مکھیوں کے انڈوں میں انڈے دیتی ہے۔ اس کے انڈوں کے کرم ان کے انڈوں کے کرم کو کھا جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پدّی، ابابیل، مکھی مار، شب پر مکھیوں اور ان کے انڈوں اور کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ تیتر، بٹیر، لوا، مرغی، بط، بگلا، بھی مکھیوں کو کھا لیتے ہیں اور کوڑے کرکٹ سے اس کے انڈوں اور کرم کو چن لیتے ہیں۔

انسان کی نادانی اور غلط فہمی

بسا اوقات بے جانے بوجھے انسان دوسری کمزور ہستیوں پر ناحق ناروا ظلم کرتا اور اُن کو تباہ کرتا ہے مثلاً بچپن ہی میں بچوں کے ذہن میں یہ بات بس جاتی ہے کہ گرگٹ اور چھپکلی زہریلے اور نقصان دہ ہیں اس کے علاوہ چھپکلی اور گرگٹ کے متعلق خاص خاص روایتیں بھی گھڑی گئی ہیں جن کی ہمارے خیال میں کوئی اصل نہیں۔ یہی وجہ

ہیں کہ بچّوں کی نظر ان پر پڑی اور پتھر کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ ان کو اور ان جیسی بہت سی مخلوق کو خدائے تعالیٰ نے خاص مصلحت سے پیدا کیا ہے جس کو ہم نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بچّوں کو ان پر ظلم کرتے دیکھ کر بڑے بوڑھے خوش ہوتے ہیں اور کچھ ترس نہیں کھاتے گویا ہماری مثال اُس فوج کی سی ہے جو گھمسان لڑائی میں آپے سے باہر ہو کر پریشانی کے عالم میں دوست دشمن کی تمیز نہیں کرتی اور نادانستہ دشمنوں کے ساتھ دوستوں کا بھی خون کرتی ہے جس کا انجام بجز اس کے اور کیا ہوتا ہے کہ دوستوں کے کم ہو جانے سے دشمن اور بھی قوی ہمت ہو کر اس کو ملیامیٹ کر دے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو انجام بخیر نظر نہیں آتا دن دونی رات چوگنی مصیبتوں کا سامنا ہوتا رہیگا۔

مکھی کا وجود پہلے مفید تھا

مکھی اور اس کے تفصیلی حالات اس سے پہلے بیان کر دیے گئے اور اس کا بھی ذکر کر دیا گیا کہ حضرت انسان کے ورود کے قبل اس کے کون کون قدرتی دشمن تھے اور کارخانہ قدرت میں ایک اعتدال اور توازن آپس کی جدوجہد سے کس خوش اسلوبی کے ساتھ قائم تھا۔ مکھیوں کا عنصر بھی اُس وقت ایک مفید مقصد کی تکمیل میں لگا رہتا تھا یعنی ہوا میں جو زہریلے اثرات ذی روح ہستیوں کے لئے مضر ہوتے تھے ان کی صفائی اسی کے ذریعہ ہوتی تھی۔ کوئی جاندار چیز مر جاتی اور عفونت ہوا میں پھیلتی تو مکھیاں فوراً پہنچ کر اس پر انڈے دیتیں اور انڈوں کا شمار تو معلوم ہی ہے ہزاروں اور لاکھوں سے کم نہیں۔ یہ انڈے کچھ گھنٹوں کے بعد کرم اور شرنقہ بن کر مردار کو کھانے لگتے اور کچھ ہی دنوں میں سب کچھ چٹ کر جاتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں جب مویشیوں کا مرض پھیلا تو یہی دیکھا گیا کہ مردار جانوروں پر مکھیوں کے انڈے اور کرم اس کثرت سے تھے کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ہوتی تھی لیکن چند ہی دنوں کے بعد دیکھا گیا کہ جانوروں کی جگہہ ایک بوٹی بھی

باقی نہیں۔

مکھیوں کی اب ضرورت نہیں

جب انسانوں نے پہلے پہل دنیا میں قدم جمائے اور ان کا گروہ اپنی حفاظت اور بچاؤ اور آرام و آسایش کے سامان کے فراہم کرنے میں مصروف ہوا تو بعض قدرت کے کارندوں کو جو انسانوں کے ورود کے پہلے آب و ہوا کی صفائی میں مصروف تھے خود بخود اپنے کارہائے مفوضہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ زمانے کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر بھیڑیئے۔ ترس وغیرہ نے کہا کہ چلو اب یہاں صفائی کے محکمے اور دفاتر قائم ہوں گے ہم جیسے پھوہڑوں کا کوئی کام نہیں۔ اور ایسا نہ کرتے تو دھکے دیکر ذلت سے نکال دیے جاتے۔ مکھی نے دل میں کہا ہوگا کہ خدا کرے انسانوں کی نظر ہم پر نہ پڑے ورنہ یہ تو معلوم ہے کہ بستی کے باہر قدم نکالا اور دشمن کا شکار ہو گئے۔ سوء اتفاق سے ہوا بھی ایسا ہی کہ کم بخت انسانوں نے محض غفلت اور نادانی کی وجہ سے ان کا کچھ خیال ہی نہیں کیا حالانکہ انھیں لازم تھا کہ پہلے اسی کو گھر سے باہر نکالتے کیونکہ محکمہ جات صفائی کے ہوتے ایسے مطلق اس کے کاروبار کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ خیر! اگلوں نے جو کچھ کیا نادانی اور لاعلمی کی حالت میں کیا۔ رونا تو اس کا ہے کہ ہم اس علوم و فنون کی ترقی کے زمانہ میں بھی تو وہی کر رہے ہیں جو وہ نہ جان کر کرتے تھے اس میں شک نہیں کہ اب بھی امراض کے جراثیم پر نہ ہمارا قابو ہے اور نہ وہ ہماری دسترس میں ہیں۔ اس صورت میں ان جراثیم اور امراض سے اگر چھٹکارا نصیب ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ ان کے معاون مکھیوں کی بیخ کنی کی جائے۔

مکھی کے دشمن اب عاجز کیوں ہیں

مکھی کے قدرتی دشمن تو اب بھی موجود ہیں اور مقدور بھر کوشش سے دریغ نہیں کرتے مگر ان کی کوششیں جو پوری طور سے بارآور نہیں ہوتیں تو اس کی اصلیت یہ ہے کہ ایک طرف تو

انسانوں کی بدولت مکھیاں ایک حد تک ان کے قابو سے نکل گئیں دوسرے اُنھوں نے اپنے گھروں میں مکھیوں کی نشو و نما اور ازدیاد کے اتنے سامان اور اس قدر سہولتیں پیدا کر دیں کہ وہ بیچارے اپنا کام کرتے کرتے عاجز آجاتے ہیں تب بھی جیسی چاہیئے ویسی کامیابی نہیں ہوتی۔ غلطی تو خود انسانوں کی ہے کہ اپنے دشمنوں کو امان دیکر اپنی ہلاکت کے اسباب جمع کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک یہ اس غلطی میں مبتلا رہیں گے اپنے کئے کی سزا بھگتینگے جس کا ذمہ دار ان کی غفلت اور سہل انگاری کے سوا اور کوئی نہوگا۔ گو بغیر سائنس کی دستگیری اور رہبری کے اس کام کا پوری پوری طور سے انجام پانا ایک دشوار امر ہے تاہم منفردہ کوششوں سے بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے گھروں میں صفائی کا معقول انتظام نہوگا اور کوڑا کرکٹ اور دنیا بھر کی عفونت اور غلاظت پڑی رہے گی تو مکھیاں نہوں گی تو کیا ہوگا یہ کام تو خود گھر والوں کا ہے کہ اپنے رہنے سہنے کا مقام اور اُس کے گرد و نواح کو پاک صاف رکھا کریں۔ اس کے لئے کوئی پہاڑ ڈہونے نہیں پڑتے۔ صرف ادنیٰ توجہ سے جانوں کی امان درد دکھ سے نجات اور گھر کی آراستگی کی آراستگی حاصل ہوتی ہے۔

(باقی دارد)

محمد اسد اللہ (حیدرآبادی)

سائنٹیفک نوٹ

نوشتہ پروفیسر فیروز دین مراد صاحب بی اے - ایم ایس سی

(۱) ہماری ہوائی خوراک

ایک شبانہ روز میں ایک آدمی کی ٹھوس، مائع اور ہوائی خوراک کی مقدار تخمیناً حسب ذیل ہوتی ہے :-

ہوا ۱۵ سیر

پانی ۲½ سیر

خوراک ۱½ سیر

ان اعداد سے ہوا کی صفائی کی ضرورت اظہر من الشمس ہے ہوا باوجودیکہ اس قدر لطیف ہوتی ہے لیکن چونکہ ہماری زندگی کا تمام تر انحصار اس میں ہر لحظہ سانس لینے پر ہے اس لئے کل مقدار اُس ہوا کی جو ہمارے پھیپھڑوں میں جاکر وظائف حیات کی تکمیل میں مُمد ہوتی ہے۔ مشروبات اور ماکولات سے کئی گنی زیادہ ہے۔ شہروں کی ہوا بالخصوص گندی ہوتی ہے۔ شاید کسی اور طریق سے صاف ہوا کی ضرورت اتنی نمایاں طور پر محسوس نہ ہو - اس لئے رسمیات کو بالائے طاق رکھ کر ہم ایک گنجان آباد شہر کے اوسط گھر کی مثال لیتے ہیں۔ کوڑا کرکٹ ادھر اُدھر بکھرا پڑا رہتا ہے اور بیت الخلا کے علاوہ جس کی صفائی بمشکل تمام دن میں دو دفعہ کی جاتی ہے جگہہ جگہہ بچوں کا فضلہ ہوا کو گندہ کرتا رہتا ہے تمام محلہ اور شہر میں یہی حال دیگر گھروں کا بھی ہوتا ہے۔ وہ ہوا جس میں سانس لیا جاتا ہے اور جس کی ایسی فراواں مقدار ہر آن منخرین کے راستہ سے ہمارے پھیپھڑوں

میں جاتی رہتی ہے ہر ایک قسم کے زہریلے متعفن اور نجس مواد سے لدی ہوتی ہے اور ہم باوجود اپنی صفائی اور پاکیزگی کے ادعاے خام کے اسی گندی ہوا کو کھاتے رہتے ہیں نتیجہ ایک سست عمل بطی الاثر زہر کی طرح یہ ہوتا ہے کہ شہریوں کے قواے عمل شل ہو جاتے ہیں اور وہ آئے دن طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہوائی خوراک کا مسئلہ کوئی ثانوی اہمیت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہوا کی صفائی کا جس قدر زیادہ خیال رکھا جائے تھوڑا ہے۔

فیروز دین مراد

(۲) "گھوڑے کی طاقت"

"گھوڑے کی طاقت" سائنس میں ایک وقیع اصطلاح ہے اور چونکہ اس کا استعمال روزانہ زندگی میں بھی بہت عام ہوتا ہے اس لئے اس کی صحیح تشریح یہاں بے محل نہ ہوگی دخانی انجنوں اور برقی کلوں کے موجودہ دور سے پیشتر انگلستان میں بہت سے ایسے کام بھی جو ہمارے یہاں بالعموم بیلوں یا بھینسوں سے لئے جاتے ہیں گھوڑوں سے لئے جاتے تھے اور اس لئے کام کی وہ اوسط مقدار جو ایک گھوڑا چوبیس گھنٹہ کے اندر کر سکتا تھا ایک مشخص ہستی بن گئی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ نہ صرف مختلف گھوڑے فی گھنٹہ یا فی منٹ مختلف مقدار کام کی کر سکتے ہیں بلکہ ان کے کام کی مجموعی مقدار بھی دن بھر میں کم و بیش وقت تک مسلسل یا بالاقساط کام کرتے رہنے کے باعث مختلف ہونی چاہیئے ان اختلافات کی باعث تا وقتیکہ ایک شبانہ روز میں کام کرنے کا اوسط وقت اور فی منٹ کام کی تخمیناً مقدار معین نہ کر دی جاتی یہ اصطلاح علمی کاموں کے لئے ہرگز نافع نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اب ایک "گھوڑے کی طاقت" سے مراد کام کی وہ مقدار ہے جو ایک گھوڑا دن بھر

میں دس گھنٹے کام کرتے ہوئے تینتیس ہزار فٹ پونڈ فی منٹ کے حساب سے کرسکتا ہے۔ فٹ پونڈ سے مراد اتنا کام ہے جتنا کہ کسی ایک پونڈ وزنی چیز کو ایک فٹ عمودوار اُدھر اٹھانے میں کرنا پڑتا ہے۔

ہم نے تشریح بالا میں طاقت کا مفہوم کام کی مقدار بتایا ہے لیکن بالعموم طاقت کام کرنے کی قابلیت کے مرادف ہے۔

آج سے ایک دو صدی قبل چند گھوڑوں کی طاقت کا انجن ایک قابل قدر مشین خیال کی جاتی تھی لیکن گذشتہ صدی میں میکانیکی ترقی اس قدر حیرت انگیز ہوئی ہے کہ اب ایک معمولی ہوائی کل کا چھوٹا سا انجن کئی سو گھوڑوں کی طاقت رکھتا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ ایسے انجن بخلاف گھوڑوں کے شب و روز لگاتار کام کرسکتے ہیں اور ان کا وزن کل گھوڑوں کے مجموعی وزن کے مقابلہ میں جن کے برابر بلکہ جن سے زیادہ یہ کام کرسکتے ہیں ہیچ ہوتا ہے۔ نصف گھوڑے کی طاقت والا موٹر بائیسکل کا انجن انہی فوائد کے باعث کئی گھوڑوں سے تیز سائیکل اور سوار کو لے اُڑتا ہے۔

(فیروز دین مراد)

قواعد

کانفرنس گزٹ

(۱) یہ رسالہ ہر ماہ کی آخر تاریخ کو دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے شایع ہوگا۔

(۲) رسالہ کا حجم تقریباً تین جزو ہوگا اور ۲۰×۲۶ تقطیع کے سفید کاغذ پر چھپیگا۔

(۳) سالانہ قیمت صرف تین روپیہ مقرر ہے جو بنام رجسٹرار صاحب محمڈن کالج علی گڑھ بھیجنا چاہیئے۔ منی آرڈر کوپن پر صاف طور سے اس کی تشریح کر دی جائے کہ یہ قیمت کانفرنس گزٹ کی خریداری کے لیے ہے اور منی آرڈر ارسال کرنے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ صاحب صدر دفتر کانفرنس کو بھی اس کی اطلاع کرنا ضروری ہے۔

(۴) سوائے ترسیل زر کے باقی جملہ خط و کتابت رسالہ کے متعلق بنام سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہان منزل علی گڑھ ہونا چاہیئے۔

خاکسار

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی آنریری جائنٹ سکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

و آنریری اڈیٹر کانفرنس گزٹ